فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوار ربانی	قرآن کا معجزہ	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	7
قولِ نبیؐ	سلام کی اہمیت	فوزیہ سعید	12
خاص مضمون	ووٹ کی شرعی حیثیت	مولانا مفتی محمد شفیع	16
نوائے شوق	نعت	عنایت علی خان	19
	غزل	شہود ہاشمی	19
	نظمیں	کرامت بخاری	20
	بہار آ گئی ہے	شمیم فاطمہ	21
حقیقت وافسانہ	اب کہہ ڈالو تو بہتر ہے	قانتہ رابعہ	23
	مدہوش	ڈاکٹر ممتاز عمر	26
	بند کھڑکی	امیمہ امجد	29
	خلش	فرحی نعیم	33
طویل کہانی (پہلا حصہ)	بول کا دیا	نصرت یوسف	40
انٹرویو	بیگم ام کلثوم قاضی سے بات چیت	فرزانہ چیمہ	49
نمایاں خواتین کا تذکرہ	حضرت رابعہ بصریہؒ	آسیہ راشد	53
سفرِ سعادت	سرزمین منیٰ الوداع	قانتہ رابعہ	56
انشائیہ	صبح قریب آ لگی ہے	شمیم فاطمہ	60
خفتگانِ خاک	خوشبو کا سفر	احمدی بیگم	62
نہاں خانۂ دل	نینو سیکنڈ	ربیعہ ندرت	64
	دل اک کشکول	ڈاکٹر رخسانہ جبین	65
سارا جہاں ہمارا	قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے	فرحت طاہر	67
حسِ معاشرت	ہر دلعزیز بنیے	آسیہ راشد	70
بتول میگزین	قراۃ العین مریم، ستارہ منصور، روبینہ عاطف، شہناز یونس		72
محشرِ خیال			77
گوشۂ تسنیم	ننگے پاؤں یا سونے کی بیساکھی	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	78

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! وہ وقت آ گیا ہے کہ ہمیں اپنی قسمت کا انتخاب کرنے کا موقع ایک بار پھر میسر ہے۔ انتخاب..... کہ اگلے پانچ سال ہمیں کیسے گزارنے ہیں۔ انتخاب..... کہ ہمیں خود پر کسے مسلط کرنا ہے۔ انتخاب..... کہ ہم نے اس مملکتِ خداداد کے معاملات کا ذمہ دار ایک بار پھر خائن، بددیانت اور خدا سے بے خوف لوگوں کو بنانا ہے یا گزشتہ چھیاسٹھ برس کی تلافی کرتے ہوئے امین اور اہل قیادت کے ہاتھوں میں اپنے اجتماعی معاملات سونپنے ہیں۔ قومی انتخابات کا ہر موقع اپنے ہاتھ سے اپنی تقدیر لکھنے کا موقع ہے، اپنے مستقبل کی صورت گری کا موقع!

جیسے جیسے الیکشن کا دن نزدیک آ رہا ہے، کراچی میں بدامنی کا گراف روز بڑھ رہا ہے۔ بدنام لسانی تنظیم کے دھڑے آپس میں قتل وغارت کر کے شہر کو ہڑتالوں پر مجبور کر رہے ہیں اور پھر ان لاشوں پر سیاست چمکاتے ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ اپنی واضح نظر آنے والی شکست سے بچنے کے لئے حالات خراب کر کے بدامنی کے بہانے میدان سے فرار ہو جائیں۔ اس وقت انتخابی عمل میں رخنہ ڈالنے کی ہر کوشش ملک دشمنوں کے ایجنڈوں کی تکمیل ہے۔ اللہ کرے کراچی اور کوئٹہ سمیت تمام ملک میں صورتحال پُرامن رہے اور شفاف انتخابات عمل میں آسکیں۔

الیکشن کمیشن اور عدالت عالیہ نے جس قدر انقلابی انداز میں امیدواروں کے کاغذات مسترد کرنے اور انہیں نااہل قرار دینے کی مہم شروع کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب کے تاریخ میں پہلی بار دفعہ 62، 63 کی چھلنیوں سے گزر کر بہتر لوگ میدانِ انتخاب میں اتریں گے مگر پھر اتنی ہی خاموشی سے یہ بساط لپیٹ دی گئی اور سب معاف ہوتے چلے گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب ہنگامہ صرف آئین کی دفعات 62، 63 کو ناقابلِ عمل ثابت کرنے کی ایک کوشش تھا۔ چند کالم نگاروں کی بوقلمونیاں تو پڑھنے کے لائق تھیں۔ واضح رہے کہ امیدواروں کے کردار سے متعلق آئین کی یہ دفعات بالکل بنیادی اور ضروری کسوٹی پر مشتمل ہیں یعنی وہ کم سے کم معیار جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے منتخب ایوانوں میں بیٹھنے والوں کے کردار کا ہونا چاہیے۔ اور ان کی روشنی میں کسی شخص کے کردار کے بارے میں ایک عام آدمی بھی آسانی سے رائے دے سکتا ہے، مگر تشریح وتوضیح کے بڑے ادق مسائل اس طرح سامنے لائے گئے جیسے یہ دفعات ناقابلِ عمل ہیں۔ یعنی وزارت اطلاعات کے خفیہ فنڈز نے اچھا خاصا کام دکھا رکھا ہے۔ ہمارے دانشور اپنے مفادات کے لئے دلائل کی شطرنج پر کیسی کیسی چالیں چلتے ہیں، یہ تماشا دیکھنے کے لائق ہے۔ کسی بھی قانون پر جب عملدرآمد ہونا شروع ہوتا ہے، تو اس قانون میں عملی مشکلات کے لحاظ سے ترامیم واضافہ ضرور کرنا پڑتا ہے، شرط یہ ہے کہ اخلاصِ نیت موجود ہو۔ ہمارے ہاں انتخابات وقت پر ہوتے رہیں اور آئین کی دفعات لاگو ہوں تو ان قوانین میں بھی وقت کے ساتھ اصلاح ہوتی رہے گی۔

عدالتِ عالیہ سے بندھی ہوئی عوامی امیدیں اب دم توڑنے لگی ہیں۔ گزشتہ دو ڈھائی برسوں میں قومی سلامتی اور انسانی حقوق سے متعلق بے شمار امور پر ازخود نوٹس اور دائر کردہ درخواستوں پر مقدمات چلتے رہے مگر فیصلے بہت کم سامنے آئے اور اگر آئے بھی تو

عملدرآمد نہ ہوسکا۔ پرویز مشرف کو بھی عدالت میں حاضر کیا گیا مگر یہ ساری کارروائی ان کو عوامی غیض وغضب سے بچانے اور سیکیورٹی فراہم کرنے کا سرکاری بندوبست محسوس ہوتی رہی۔

بوسٹن بم دھماکے افسوس ناک ہیں، مگر انہوں نے ایک بار پھر مسلمان ملکوں کے لئے جاری امریکہ کی دہشت گردانہ پالیسیوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو چیچن مسلمان نوعمر لڑکوں کو ملزم گردانا جارہا ہے۔ حقیقت حال جو بھی ہو، دہشت گردی کا ایک آدھ ایسا واقعہ کس طرح مسلمان ملکوں کی پوری پوری آبادیوں اور پرامن شہریوں کو بھگتنا پڑتا ہے، اس حقیقت سے اب ساری دنیا آگاہ ہوچکی ہے۔ وہاں مرنے والے دو تین بچوں کے بدلے میں مسلمان آبادیوں کے کتنے معصوم پھول خاک وخون میں نہلا دیے جائیں گے۔ اس کا حساب لینے والا خدا کی ذات کے سوا کوئی نہیں۔

دھواں تو ایک سا اٹھتا ہے ہر عمارت سے
وہ جل رہی کہیں سوڈان یا عراق میں ہو
بدن کے آگ میں جلنے کی بو تو یکساں ہے
تڑپ رہا یہ بدن جس طرح کی خاک میں ہو
لہو تو ایک سا بہتا ہے سارے جسموں میں
بہے اگرچہ سرِراہِ وادیِ کشمیر
کلیجہ ایک سا ہوتا ہے ساری ماؤں کا
وہ کٹ رہا ہو اگرچہ کنارِ وادیِ نیل
کسی کی سانس ہو ملبے میں گھٹ ہی جاتی ہے
کوئی بساط ہو آخر اُلٹ ہی جاتی ہے
ہو جس قدر بھی توانا، خدا نہیں کوئی
قسم خدا کی، خدا کے سوا نہیں کوئی

ایک بروقت، پرامن، شفاف اور پاکستانی قوم کی بیداری کے غمّاز انتخابات کی دعا کے ساتھ اگلے ماہ تک اجازت دیجیے۔

طالبہ دعا
صائمہ اسما

☆☆☆

ڈاکٹر مقبول احمد شاہد

قرآن کا معجزہ

وہ کتاب جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی کتاب نہیں لائی جاسکتی، جو زبان وادب کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور تعلیم وحکمت کے لحاظ سے بھی

معجزات کی حیثیت:

قرآن کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو کچھ معجزے عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضاء کے معجزے دیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے اور مردوں کو تھوڑی دیر کے لیے زندہ کر دیتے تھے۔ وہ مٹی کے گارے سے ایک پرندے کی شکل بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ زندہ پرندہ بن کر اڑ جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہونا اور زندہ اٹھایا جانا بھی معجزہ تھا۔

حضرت سلیمانؑ کا معجزہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور پرندوں کے لشکر ان کے تابع کر دیے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے معجزے کے طور پر آگ کے الاؤ کو گل و گلزار بنا دیا گیا۔ انھوں نے اللہ کے حکم سے کچھ پرندے ذبح کیے اور ان کے ٹکڑے مختلف پہاڑوں پر رکھ دیے پھر جب انھوں نے ان پرندوں کو پکارا تو وہ زندہ ہو کر ان کی طرف پلٹ آئے۔ حضرت ایوبؑ کے پاؤں کی ضرب سے اللہ تعالیٰ نے صاف میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ حضرت یوسفؑ کے قمیص سے ان کے والد حضرت یعقوبؑ کی بینائی لوٹ آئی۔ حضرت صالحؑ کے ہاتھوں ایک اونٹنی معجزے کے طور پر پیدا ہوئی جسے اللہ کی اونٹنی کہا گیا۔ حضرت زکریاؑ اور ابراہیمؑ کو بڑھاپے میں بانجھ بیویوں کے ذریعے اولاد دی گئی۔ حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لیا گیا۔

ان سب معجزوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مستقل نوعیت کے معجزے صرف حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئے جو بار بار ظاہر ہوتے رہے۔ کچھ حد تک حضرت سلیمانؑ کے لیے جنوں اور پرندوں کے لشکر مسخر کرنا بھی ایک مستقل نوعیت کا معجزہ تھا جو عمر بھر ان کے ساتھ رہا۔ باقی تمام انبیاء کے معجزے عارضی اور وقتی تھے جو بس ایک مرتبہ ظاہر ہوئے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے صرف چند انبیاء کو ہی معجزے دیے گئے اور ان میں سے بھی اکثر معجزے وقتی اور عارضی تھے۔ حضرت

نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت شعیبؑ جیسے جلیل القدر انبیاء کے بارے میں کسی معجزے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے اکثر انبیاء کے بارے میں کسی معجزے کا ذکر نہیں ہے۔اس سے جو اہم بات ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبوت کے لیے معجزے کا ہونا ضروری نہیں ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ انبیاء کو معجزے دیے گئے تو وہ خاص حالات میں خاص ضرورت کے لیے دیے گئے۔ انبیاء کا کام اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور عقلی دلائل سے اس پیغام کی صداقت ان پر واضح کرنا تھا۔ معجزے کچھ انبیاء کو اتمام حجت کے لیے تو دیے گئے لیکن ان کی وجہ سے کوئی قوم انبیاء پر ایمان نہیں لائی۔ نہ فرعون کی قوم حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائی اور نہ ہی بنی اسرائیل کی اکثریت حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائی۔حضرت موسیٰؑ پر جادوگروں کے ایمان لانے میں آپؑ کے معجزات سے مدد ضرور ملی لیکن ایمان ان کے دلوں میں تبھی اترا جب وہ توحید اور آخرت کے قائل ہو گئے، جیسا کہ ایمان لانے کے بعد فرعون کے ساتھ ان کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے۔ جب فرعون نے انھیں دھمکی دی کہ ایمان لانے کی پاداش میں میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوادوں گا اور تمھیں سولی چڑھادوں گا، تو اس کے جواب میں جادوگروں نے کہا:

''کچھ پروا نہیں ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔'' (الشعراء ۵۰-۵۱)

ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان محض لاٹھی کو سانپ بنتا دیکھ کر حاصل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کے ادراک سے حاصل ہوتا ہے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب قیامت تک جتنے لوگ بھی ایمان لائے اور آئندہ لائیں گے ان کو معجزہ دکھانے کے لیے کوئی نبی موجود نہیں ہے۔ وہ تو عقلی دلائل سے اسلام اور قرآن کی حقانیت کو جانچ کر ہی ایمان لائیں گے۔

نبی کریمؐ سے کفار قریش کا معجزات کا مطالبہ:

حضرت عیسیٰؑ کے پانچ سو سال بعد جب مکہ مکرمہ میں رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب پر فائز کیا گیا تو کفار قریش نے آپؐ سے مطالبہ کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہمیں اس طرح کے معجزے دکھائیں جیسے کہ اس سے پہلے انبیاء کو دیے

گئے تھے۔

''وہ کہتے ہیں بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اس کی من گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے، ورنہ یہ لائے کوئی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔'' (الانبیاء ۵)

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ مشرکین عرب اس بات سے ناواقف نہ تھے کہ ماضی میں اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء مبعوث کرتا رہا ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ نے کچھ معجزات بھی عطا کیے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب قبائل خصوصاً قریش مکہ کے اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں سے میل جول اور تعلقات تھے۔ مدینہ اور اس کے شمال میں خیبر کے علاقے میں بہت سے یہودی قبائل آباد تھے جن سے عرب قبائل کی تجارت تھی اور ان کے ذریعے سے حضرت موسیٰؑ اور تورات سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا بھی انھیں علم تھا۔ اسی طرح اس وقت یمن، شام، حبشہ، اردن اور مصر میں عیسائی آباد تھے جو رومی سلطنت کا حصہ تھے۔ عرب قبائل کے تجارتی قافلے ان ملکوں میں جاتے تھے اور وہ حضرت عیسیٰؑ اُن کے معجزات اور انجیل سے واقف تھے۔ اس لیے جب نبی کریمؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو قریش مکہ نے آپؐ سے بھی مطالبہ کیا کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو کوئی نشانی (معجزہ) دکھائیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرکین عرب ایک طرف تو نبی کریمؐ سے آپؐ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور دوسری طرف حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ جن کے معجزوں کا ان کو علم تھا، ان پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ سے ان کا معجزوں کا مطالبہ کرنا محض ایک شرارت تھی اور آپ کی نبوت کے انکار کا ایک بہانہ تھا ورنہ ان سے یہ توقع بالکل نہیں تھی کہ اگر ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جاتا تو وہ ایمان لے آتے۔ کیونکہ اگر انھوں نے معجزے دیکھ کر ایمان لانا تھا تو سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانا چاہیے تھا جن کے معجزوں کا وہ حوالہ دیتے تھے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح بیان فرمائی:

''مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟'' (القصص ۴۸)

یہ بات کہ یہ لوگ کوئی نشانی (معجزہ) دیکھ کر بھی ایمان لانے والے نہیں تھے، قرآن میں اس طرح فرمائی

گئی:

''اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دیہاڑے اس پر چڑھنے بھی لگتے، تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔'' (الحجر ۱۴، ۱۵)

''اے پیغمبرؐ! اگر ہم تمھارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔''

(الانعام ۷)

مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جن معجزوں کا مطالبہ کرتے وہ بعض اوقات انتہائی مضحکہ خیز ہوتے جیسا کہ درج ذیل آیات میں بیان فرمایا گیا:

''ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار پر ہی جمے رہے اور انھوں نے کہا ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں .....اے نبی ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار، کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟''

(بنی اسرائیل ۸۹ تا ۹۳)

قرآن کا معجزہ:

قرآن کریم میں کفار و مشرکین کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزے کے مطالبے کا ذکر کم و بیش پچیس مقامات پر ہمیں ملتا ہے اور ہر جگہ موقعہ کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ لیکن سورۃ العنکبوت آیات ۵۰، ۵۱ میں ایک حتمی بات کہی گئی اور وہ یہ کہ آپؐ کو دیا گیا معجزہ اور آپؐ کی نبوت کا ثبوت یہ قران مجید ہے جو آپؐ پر نازل کیا گیا۔ آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

''یہ لوگ کہتے ہیں، کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں (معجزات) اس کے رب کی طرف سے؟ کہو، نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ

(نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

یعنی قرآن جیسی کتاب کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا کیا بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ آپؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے کافی ہو کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنھوں نے دیکھے ان کے لیے معجزے تھے مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمھارے سامنے ہے۔ تمھیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے، تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔

یہی بات سورۂ ق میں اس طرح کہی گئی۔

''ق۔ قسم ہے قرآن مجید کی۔ بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے آ گیا۔'' (ق ۱،۲)

یہاں قرآن کے لیے مجید کا لفظ استعمال کیا گیا۔ یعنی ایک بلند مرتبہ، باعظمت، بزرگ، صاحب عز و شرف، کریم، کثیر العطاء، رہنما، بہت نافع، قرآن کے لیے مجید کی صفت استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتی۔ اپنی زبان اور ادب کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے اور اپنی تعلیم اور حکمت کے لحاظ سے بھی معجزہ۔

اور ایسی کتاب صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی وحی کے ذریعے نازل ہوسکتی ہے، کسی انسان کی تصنیف نہیں ہوسکتی اور جس شخص پر یہ کتاب نازل ہو رہی ہے وہ لامحالہ اللہ کا رسول ہی ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس بات میں کوئی تعجب کرنے کی وجہ نہیں ہے کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے معجزہ ہونے کی متعدد صورتیں ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں:

۱۔ رسول کریمؐ کا اُمی ہونا:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت محمدؐ اُمی تھے یعنی آپ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ قریش مکہ اور تمام اہل عرب اس حقیقت سے باخبر تھے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آپ کے اُمی ہونے کی گواہی ان الفاظ میں دی ہے:

''(پس آج اللہ کی رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی اُمی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر ان اہل کتاب کو اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا

ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی (قرآن) کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اے محمدؐ کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی۔ امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔" (الاعراف ۱۵۷، ۱۵۸)

احادیث کی کتب بخاری اور مسلم میں براء بن عازبؓ سے یہ روایت درج ہے کہ جب ۶ ہجری میں مکہ مکرمہ سے باہر حدیبیہ کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو اس کے اوپر یہ لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمدؐ رسول اللہ اور قریش مکہ کے درمیان ہے۔ اس پر کفار مکہ نے اعتراض کیا کہ ہم تو محمدؐ کو اللہ کا رسول تسلیم ہی نہیں کرتے اس لیے یہاں محمد رسول اللہ کی بجائے محمدؐ بن عبداللہ لکھا جائے۔ نبی کریمؐ نے ان کی بات مان لی اور حضرت علیؓ جو معاہدہ کی کتابت کر رہے تھے ان سے آپ نے کہا کہ رسول اللہ کے الفاظ کاٹ دیں۔ اس پر حضرت علیؓ نے کہا خدا کی قسم میں تو یہ الفاظ کبھی نہ کاٹوں گا۔ اس پر آپؐ نے ان سے کہا کہ اچھا مجھے بتاؤ یہ الفاظ کہاں لکھے ہوئے ہیں۔ جب حضرت علیؓ نے ان کی نشاندہی کر دی تو آپ نے خود ان الفاظ کو اپنے ہاتھ سے کاٹ دیا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے اور مشرکین عرب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ آپؐ کے پاس کوئی لائبریری نہیں تھی جس سے استفادہ کر کے آپ قران کی آیات بنا بنا کر لا سکتے۔ آپؐ کے گھر سے کبھی کوئی کاغذ کا ایک پرزہ بھی برآمد نہیں ہوا جس پر کوئی عبارت لکھی ہوئی ہو۔ پھر اُمی ہونے کے باوجود آپ کی زبان پر قرآن کی انتہائی فصیح و بلیغ مضامین پر مشتمل آیات جاری ہونا ایک معجزہ ہی تھا۔

۲۔ نبی کریمؐ کو چالیس سال کی عمر میں قرآن عطا ہونا:

نبی کریمؐ نبوت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے چالیس سال مکہ مکرمہ میں رہے۔ اس تمام عرصہ میں کسی نے بھی آپؐ کی زبان سے قرآن کی آیت یا اس سے ملتے جلتے الفاظ نہیں سنے تھے۔ پھر جب آپ کو نبوت عطا ہوئی تو ایسا کلام آپ کی زبان پر جاری ہو گیا جس کی کوئی مثال نہ اس زمانے میں موجود تھی اور نہ اس کے بعد کوئی ایسا کلام لا سکا۔ اس کلام میں ایسی تعلیمات تھیں جن سے اس سے پیشتر خود نبی کریمؐ ناواقف تھے۔ پھر یکا یک غیب سے یہ مضامین آپ کی زبان سے ادا ہونے لگے۔ یہ قرآن کا عظیم معجزہ تھا۔ پھر اس کے بعد بھی زندگی کی آخری ساعت تک آپ انہی لوگوں میں رہے۔ آپ کی اپنی گفتگو، تقریروں اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں ان کا ایک حصہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی دان لوگ پڑھ کر خود با آسانی دیکھ سکتے ہیں کہ آپ کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا اور کتاب اللہ کی آیات کا طرزِ بیان کیسا ہے۔ ان میں زمین آسمان کا فرق سب کو نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں آپؐ کے کسی خطبے کے بیچ میں اس کتاب کی کوئی عبارت آ جاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔

یہی بات اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

''اور کہو! اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمھیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تم لوگوں کو اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟'' (یونس ۱۶)

''کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے، وہ برتر اور حکیم ہے، اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) تمھاری طرف وحی کی ہے تمھیں تو کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔ مگر اس روح کو ہم نے روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ اور یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔'' (الشوریٰ ۵۱، ۵۲)

۳۔ قرآن کی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں:

قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ اس طرح کا کلام لانے پر کوئی قادر نہیں ہوسکتا۔ قرآن کا یہ چیلنج اس وقت بھی تھا جب یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہورہا تھا، اب بھی ہے، اور آئندہ قیامت تک رہے گا۔ کوئی بڑے سے بڑا زبان دان، علامہ، ادیب، شاعر ایک آیت بھی قرآن کی مانند بنا کر نہیں لاسکتا۔ جس قوم اور جس زمانے میں یہ نازل ہوا اس وقت کے اہل عرب اپنے ادب، لٹریچر، زبان دانی، شاعری اور فصاحت و بلاغت اور طرزِ بیان پر فخر کرتے تھے اور اپنے سوا باقی سب قوموں کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم عرب لوگ جس طرح بات کر سکتے ہیں اور اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہیں اس کے مقابلے میں باقی قومیں گونگی ہیں۔ ان کو بات بھی کرنی نہیں آتی۔ اس عرب قوم کو قرآن نے یہ چیلنج دیا کہ تم اس جیسی ایک سورت ہی بنا لاؤ یا چند آیتیں ہی بنا لاؤ۔

مشرکین عرب کہتے تھے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ محمدؐ یہ آیات خود بنا بنا کر لا رہے ہیں اور کوئی دوسرے لوگ بھی ہیں جو ان کی اس کام میں مدد کرتے ہیں۔ اس پر انھیں کہا گیا کہ اچھا اگر محمدؐ خود ایسا کلام تصنیف کر سکتے ہیں تو تم بھی کر سکتے ہو۔ پھر کیوں ایسا نہیں کرتے ذیل کی آیات میں یہی بات کہی گئی ہے۔

''کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو، اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو جو (تمھارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اب اگر وہ (معبود) تمھاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ تو پھر کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو؟'' (ہود ۱۳، ۱۴)

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اس کتاب کو خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو، اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلا لو۔'' (یونس ۳۸)

''کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔'' (بنی اسرائیل ۸۸)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔ (الطّور ۳۳۔۳۴)

اوپر کی چار آیتوں میں مخاطب مشرکین عرب اور خصوصاً قریش مکہ تھے۔ ہجرت کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لے گئے تو وہاں عام انسانوں کے علاوہ اہل کتاب (یہود) کو بھی یہی چیلنج دیا گیا۔

''اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کی مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو۔ اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔ جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔'' (البقرہ ۲۳۔۲۴)

علمائے یہود کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی کتاب (تورات) میں تحریف کرنے میں بہت ماہر تھے، وہ اپنے پاس سے ایک آیت گھڑ لیتے اور اُسے تورات کی آیتوں میں اس طرح شامل کر دیتے کہ لوگ پہچان نہ سکتے تھے۔ ان کا مقصد ایسی آیتوں سے لوگوں کو خوش کر کے کچھ پیسے بٹورنا ہوتا تھا۔ ان کی اس مہارت اور بد دیانتی کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے۔

''پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب (کی کچھ آیات) لکھتے ہیں اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ آیات اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، تاکہ اس کے معاوضہ میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی موجب ہلاکت۔'' (البقرہ ۷۹)

یعنی قرآن کے اس چیلنج کے جواب میں مدینے کے یہ یہود جو جعلی آسمانی آیات گھڑ لینے میں بہت مشاق اور ماہر تھے، قرآن کے مقابلے میں ایک بھی آیت بنا کر نہ لا سکے۔ اور اس کے بعد بھی اہل کتاب یا کسی شخص کو کبھی ایسی جرأت نہ ہو سکی۔ یہ قرآن کا عظیم معجزہ ہے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

سلام کی اہمیت

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ۹۹ صفاتی نام ہیں، جن میں ایک ''السلام'' ہے اور قرآن پاک کی سورۃ الحشر میں مذکور ہے۔ اس کا مطلب ہے ''سراسر سلامتی'' اور یہ مبالغے کا صیغہ ہے کہ ایسی ذات جس پر کبھی کسی حادثے یا نقصان کا وقوع نہ ہو اور جو کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی رضا و خوشنودی کو ''سبل السلام'' سلامتی کے راستے کا نام دیا ہے۔ (۱۶:۵)۔ اور فرمایا: 'واللہ یدعوا الی دارالسلام' (۲۵:۱۰) اور اللہ تمھیں جس چیز کی طرف بلاتا ہے وہ سلامتی کا گھر (جنت) ہے۔ اسی طرح جنت کو ''دارالسلام'' کہا گیا ہے۔ (سورۃ الانعام ۱۲۷) اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور راہنمائی کی پیروی کرنے والوں پر سلامتی بھیجی ہے۔ 'والسلام علی من اتبع الھدیٰ' (۴۵:۲۰) اسی طرح جنگ میں داخل ہونے والوں کو سلامتی کی دعائیں دی گئی ہیں اور جنتیوں کی یہ خوبی بتائی کہ وہ جنت میں ایک دوسرے پر سلامتیاں بھیجیں گے۔ سورۃ الصافات میں اللہ نے حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام کے واقعات کے تذکرے کے بعد فرمایا:

'سلم علی المرسلین' اور سلامتی ہو ان رسولوں پر (سورۃ الصافات ۷۹، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۸۱)۔

رسول مہربان صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے گئے تو آپ نے سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر کہا: التحیات للہ والصلوات والطیبات اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: 'السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ' اے نبی! آپ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں۔ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین' سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر۔

السلام علیکم کی ابتدا کیسے ہوئی؟

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح

البخاری میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان سے فرمایا کہ فرشتوں کے اُس گروہ کے پاس جاؤ جو سامنے بیٹھے ہیں اور انھیں السلام علیکم کہو۔ پھر دیکھو کہ وہ تمھیں کیا جواب دیتے ہیں۔ تو یہی جواب تمھارا اور تمھاری اولاد کا ہو گا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کے گروہ سے جا کر کہا: ''السلام علیکم'' انھوں نے جواب دیا: ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ'' یعنی انھوں نے ورحمۃ اللہ کا اضافہ کر دیا۔

سلام کیسے کیا جائے؟

کسی بھی زبان کو بولتے ہوئے اگر الفاظ کی ادائیگی میں تلفظ درست نہ ہو تو مطلوبہ معانی و مفہوم اور گفتگو کا مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عربی زبان بولتے ہوئے اگر تلفظ درست نہ ہو تو معانی یک سر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر قلب (دل) کے ق کو درست تلفظ سے نہ پڑھا گیا تو کلب (کتا) بن جائے گا۔ چنانچہ ہمیں سلام کرتے ہوئے اس اصول کا خصوصاً خیال رکھنا ہو گا۔ اور السلام علیکم کو صحیح تلفظ سے کہنا ہو گا۔ اسی صورت میں ہم نے سلامتی کی دعا دی، وگرنہ السام علیکم یا سام لیکم کہنے سے سلامتی کی دعا نہ ہو گی۔ ہم عام طور پر اس کا اہتمام نہیں کرتے جس کی وجہ سے سلام کرنے کے فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے ہمیں بخوبی اس بات کا اندازہ ہے کہ ہم جس Option پر کلک کرتے ہیں وہی فائل کھلتی ہے۔ بعینہٖ جو الفاظ ہم اپنی زبان سے بولیں گے فرشتے ان الفاظ کو اسی طرح لکھیں گے اور ہم ثواب سے نوازے جائیں گے یا محروم رہ جائیں گے۔

درست تلفظ کے علاوہ سلام کرتے ہوئے چہرے کے تاثرات، آواز اور لب و لہجہ کو بہت عمل دخل ہے۔ سلام مسکراتے چہرے سے کرنا چاہیے کیونکہ سلام کرتے ہوئے آپ دوسرے کو امن و سلامتی کی دعا دے رہے ہیں اور اس کے جواب میں آپ کو بھی امن و سلامتی کی دعا ملنے والی ہے اور اس دور کی سب سے اہم ضرورت امن و سلامتی ہی ہے۔ سلام کرتے ہوئے آواز اتنی اونچی ضرور ہونی چاہیے کہ سامع سن سکے ورنہ صرف ہونٹوں پر جنبش سے مطلوبہ مقصود حاصل نہ ہو گا اور لب و لہجہ بھی ایسا ہونا چاہیے کہ سننے والے کو اپنائیت کا احساس ہو چاہے آپ کسی اجنبی کو ہی سلام کر رہے ہوں، کیونکہ ہمیں یہی تعلیم دی گئی ہے: (سلام کرو اس کو جسے تم جانتے ہو اور اس کو جسے تم نہیں جانتے۔ ابی داؤد) ہمارا

حال یہ ہوتا ہے کہ دوست احباب کو تو بہت پر جوش سلام کرتے ہیں لیکن کسی اجنبی کو سلام کرتے ہوئے ہمارے لب و لہجہ سے لگ رہا ہوتا ہے کہ گویا ہم سلام کرتے ہوئے یہ سوال پوچھ رہے ہیں آپ کون؟ اسی طرح اگر کوئی قریبی دوست سلام کرے تو بہت پر جوش جواب دیتے ہیں اور اگر کوئی اجنبی سلام کرے تو جواب میں یہ سوال پوشیدہ ہوتا ہے کہ آپ کون؟

اس سلسلے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں جو اصول دیا ہے اس کے الفاظ پر غور کیجیے:

واذا حییتم بتحیته فحیوا باحسن منها او ردوها (سورۃ النساء ۸۶)

اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا اُسی طرح۔

سلام کرنے اور جواب دینے کی اہمیت:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم ایمان نہ لاؤ اور تم ایمان نہیں لا سکتے جب تک کہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے لگو۔ تمھیں ایک ایسا عمل نہ سکھا دوں کہ اگر تم کرو گے تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟ تو سلام کو آپس میں رواج دو۔ (سنن ابی داؤد ۵۱۹۳ ابواب السلام)۔

(۱) اس حدیث کے اسلوب بیان پر غور کیا جائے تو سلام کرنے کی انتہائی اہمیت سمجھ میں آتی ہے کہ ایمان جنت میں جانے کی بنیادی شرط ہے اس کا حصول آپس میں محبت کیے بغیر ممکن نہیں اور محبت کرنے کے لیے رسول مہربان صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی شفقت اور مہربانی سے جو اصول ہمیں سکھایا وہ آپس میں سلام کو رواج دینا اور پھیلانا ہے۔ کوئی چیز رواج کیسے بن سکتی ہے؟ کوئی لباس یا انداز گفتگو رواج اس طرح بن جاتا ہے جب اکثریت اسے اختیار کر لیتی ہے۔ گویا یہ سکھایا جا رہا ہے کہ ہر ایک اس کا اہتمام کرے اور اہتمام کس حد تک ہو؟ اس کا جواب نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی (یعنی دوسرے مسلمان) سے ملے تو اُسے سلام کرے اور اگر کوئی درخت، دیوار یا پتھر درمیان میں حائل ہوں پھر دونوں ملیں تو پھر سلام کریں (سنن ابی داؤد ۵۲۰۰)

یہاں ہماری اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو گیا کہ عام طور پر ہمارا یہ خیال ہے کہ صبح ایک مرتبہ سلام کر لیا جائے تو یہ شام تک کے لیے کافی ہے آفس اور ادارے میں

کام کرنے والے افراد جب صبح آئیں تو سلام کرلیں وہ دن بھر کے لیے کافی ہے۔ اور ایک سے دوسری مرتبہ سلام کرنے والے فرد کو سلام دین کے لقب سے نواز دیا جاتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور حدیث کے الفاظ کچھ یوں ہیں: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا جن میں سے ایک ہے کہ سلام کو پھیلاؤ (صحیح بخاری) ایک اور حدیث جو اہمیت کے اعتبار سے قابل توجہ ہے: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا سلام بہتر ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کھانا کھلاؤ اور سلام کرو۔ جس کو تم جانتے ہو اور جس کو تم نہیں جانتے۔ (سنن ابی داؤد ۵۱۹۴)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں اس میں ایک سلام کا جواب دینا ہے (صحیح مسلم)۔ اس سے پتہ چلا کہ صرف سلام کرنا ہی اہم نہیں بلکہ جواب دینا بھی ضروری ہے۔

سلام کرنے کا اجر وثواب:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو فطرتاً ایسا بنایا ہے کہ اس کو جس کام کے کرنے کا فائدہ اور اجر وثواب سمجھ آجائے اس کے حصول کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور کوششیں لگا دیتا ہے۔ چنانچہ سلام کرنے کا پہلا اجر تو یہ ہے کہ سلامتی کی دعا ملتی ہے اور اگر یہ لمحات دعا کی قبولیت کے ہوئے تو خیر کثیر حاصل ہوگئی۔ نبی مہربان صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا یہ اجر وثواب بتایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا ''السلام علیکم''۔ نبی مہربانؐ نے اُس کے سلام کا جواب دیا، وہ بیٹھ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دس (یعنی اس کو دس نیکیاں ملیں)۔ پھر ایک اور شخص آیا اور کہا: 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ' نبی مہربان نے جواب دیا وہ بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا: بیس (یعنی اس کو بیس نیکیاں ملیں)۔ تیسرا شخص آیا اور کہا 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ' نبی مہربان نے جواب دیا وہ بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا: تیس۔ یعنی اس شخص کو تیس نیکیاں ملیں۔ ایک روایت ہے جس میں اضافہ یوں ہے کہ ایک اور شخص آیا اُس نے کہا: 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ ومغفرتہ'۔ آپؐ نے فرمایا: چالیس۔ یعنی اس شخص کو چالیس نیکیاں ملیں اور فرمایا: دیکھو اس طرح سے اعمال کی فضیلت ہے (سنن ابی داؤد)۔

اس حدیث سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ سلام کرتے ہوئے جس قدر اہتمام کیا گیا اُسی قدر نیکیوں میں اضافہ ہوجائے گا اور بہرحال نیت کا عمل دخل تو اُسی قدر ہے جو دین کے ہر معاملے میں ہے۔ ایک اور روایت میں ہے۔ حضرت انسؓ نے کہا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے میرے بیٹے! جب تم گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو۔ یہ تمھارے لیے اور تمھارے گھر والوں کے لیے باعث برکت ہے'' (جامع الترمذی) 'برکت' کا لفظ ہم دن میں کئی مرتبہ بولتے ہیں۔ ہر خوشی کے موقع پر یہ دعا دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھار طنزاً بھی یہ دعا دیتے ہیں کہ 'اللہ آپ کو ہی مبارک کرے'۔ اس کا مطلب ہے 'اللہ اس کو آپ کے لیے باعث خیر و برکت بنائے'۔ برکت کا مطلب ہے فراوانی اور زیادتی یا اضافہ۔ اس دعا میں تمام نعمتوں میں برکت مانگی جارہی ہے جو اللہ نے ہمیں عطا کی ہیں مثلاً صحت، عمر، عافیت، مال و دولت، آل و اولاد اور علم و ہنر میں اضافہ اور فراوانی۔

سلام پہنچانا اور بھیجنا:

اس موضوع پر تحریر کے دوران ایک دلچسپ بات جو صحاح ستہ کے مطالعے سے سامنے آئی وہ یہ کہ سلام صرف کرنے اور جواب دے دینے تک محدود نہیں بلکہ 'سلام پھیلاؤ' یا 'سلام کو رواج دو' کے اصول کو اپنانے کا ایک طریقہ سلام بھیجنا اور پہنچانا بھی ہے اور یہ 'سنت اللہ' (اللہ کا طریقہ) ہے۔ اس سلسلے میں 'اللہ کا حضرت خدیجہؓ کو سلام بھیجنے کا دلچسپ اور قابل رشک واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ صحیح بخاری میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل علیہ السلام آئے جبکہ آپ غارِ حرا میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ خدیجہ آپ کے پاس آرہی ہیں۔ ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں کھانا یا پانی ہے۔ جب وہ آپ کے پاس آجائیں تو انہیں رب تعالیٰ کی طرف سے اور میری طرف سے سلام کہنا اور انہیں جنت میں ہیرے موتی سے بنے ہوئے ایسے گھر کی خوشخبری دینا جس میں نہ شور وغل ہوگا اور نہ ہی تھکاوٹ ہوگی (صحیح بخاری) ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ملتا ہے **'قالت ھو السلام منہ السلام و علی جبریل السلام'**۔ سیدہ خدیجہؓ نے کہا: اللہ سلامتی والا ہے اس کی طرف سے سلام آیا ہے اور جبریل پر بھی سلامتی ہو۔ (صحیح بخاری)

اس حدیث سے نہ صرف سلام بھیجنے اور پہنچانے کا اصول ملا بلکہ حضرت خدیجہؓ کے جواب سے سورۃ النساء کی آیت 'واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا او ردوھا' کی عملی تفسیر بھی مل گئی کہ سلام کا جواب اس سے بہتر دیا جائے یا کم از کم ویسا ہی اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو جبریلؑ کا پیغام پہنچایا اور ان کا جواب بھی قابل تقلید ہے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! جبریلؑ آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: 'وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' (صحیح بخاری)

سلام بھیجنے اور پہنچانے کی یہ سنت جو اللہ، اس کے فرشتے اور رسول مہربان صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہے صحابہ کرامؓ نے بھی اس کو اختیار کیا۔ سیرت صحابہؓ سے ہمیں ایسی ہی ایک مثال ملتی ہے۔

اسماعیلؒ کہتے ہیں کہ ہم حسنؒ کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اس نے کہا مجھ سے میرے والد نے اور انھوں نے دادا سے بیان کیا کہ مجھے میرے والد نے نبیؐ کے پاس بھیجا اور کہا کہ اُن سے میرا سلام کہو۔ چنانچہ میں گیا اور کہا کہ میرے والد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ 'علیک و علی ابیک السلام' تم پر اور تمھارے والد پر سلام ہو۔'' (سنن ابی داؤد)

<u>سلام میں پہل کرنا:</u>

نیکی کرنے کے سلسلے میں اس کا اصول ہے 'فاستبقوا الخیرات' نیکیوں میں سبقت لے جاؤ۔ چنانچہ سلام میں پہل کرنے کی سنت پر عمل کرنے کی ترغیب ان الفاظ میں دلائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کے نزدیک تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو سلام میں پہل کرتا ہے (ابی داؤد) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گفتگو شروع کرنے سے پہلے سلام کرو۔ (جامع ترمذی) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی یہی ہے کہ آپؐ سلام میں پہل کیا کرتے تھے۔

<u>خواتین اور بچوں کو سلام کرنا:</u>

اسوۂ حسنہ سے رسول مہربان صلی اللہ علیہ وسلم کا خواتین اور بچوں کے ساتھ جو معاملہ سامنے آتا ہے وہ قابل توجہ بھی ہے اور قابل تقلید بھی اور ہمیں اپنے معاملات پر احتسابی نظر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ حضرت انسؓ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے پاس

آئے اور وہ کھیل رہے تھے۔ آپؐ نے ان کو سلام کیا (سنن ابی داؤد ۵۲۰۲)۔ حضرت اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے (خواتین کے) پاس سے گزرے اور ہمیں سلام کیا (سنن ابی داؤد ۵۲۰۴) اور اسی سے متعلق سیرت صحابہ سے عملی نمونہ بھی ملتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ بچوں کے پاس سے گزرے اور بچوں کو سلام کیا اور فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری)

کون کس کو سلام کرے:

اسلام مکمل نظام زندگی ہے جو زندگی کے ہر معاملے میں ہر اعتبار سے مکمل راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ سلام کرنے کی ترغیب میں یہ بھی سکھا دیا گیا ہے کہ کون کس کو سلام کرے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ چلنے والے بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑی تعداد بڑی تعداد کو۔ سوار پیدل چلنے والے کو''۔ (صحیح بخاری)

''چھوٹا بڑے کو سلام کرے'' یہ عمومی حکم دے کر بچوں کو بڑوں کا ادب احترام اور عزت کرنا سکھائی گئی ہے۔ جس کے لیے نبی مہربان صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ہمارے بچوں سے پیار و محبت نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ لیکن اگر کسی بڑے کو ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ جائے جس میں چھوٹے اس کو سلام نہ کریں تو اس کو عزت کا مسئلہ بنائے بغیر سلام میں پہل کرنے کے اجر و ثواب کو سامنے رکھتے ہوئے سلام کر لیں (آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کو سلام کرتے تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کر کے نسبتاً زیادہ اجر سمیٹ لیں۔

''تھوڑی تعداد زیادہ کو'' اس میں اسلام کا نظام نظم و ضبط آتا ہے کہ اگر زیادہ تعداد کرے گی تو شور و غل مچ جائے گا۔

''سوار پیدل کو'' اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ سوار کے دل میں بڑائی پیدا نہ ہو اور پیدل چلنے والا احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر اہل کتاب سلام کریں تو کہو: وعلیکم'' (مسلم)

سبحان اللہ پاک ہے وہ ذات جس نے زندگی گزارنے کا اتنا خوبصورت سلیقہ ہمیں سکھایا۔ یا رب ہمیں زندگی گزارنے کا وہ طریقہ سکھا جس سے تو ہم سے راضی ہو جائے۔ (آمین ثم آمین)

☆☆☆

امیدوار، ووٹر اور

ووٹ کی شرعی حیثیت

اسلام کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی۔ ہر زمانہ اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پر سختی سے قائم رہتے ہیں جن کو اپنے ہر کام میں حلال وحرام کی فکر اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا جوئی پیش نظر رہتی ہے۔ پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے۔'' اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ انتخابات میں امیدوار اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور ان کی اہمیت کو قرآن اور سنت کی رو سے واضح کر دیا جائے۔ شاید کچھ بندگانِ خدا کو تنبیہ ہو اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

اُمیدواری:

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لیے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے۔ ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا امیدوار ہے۔ دوسرے یہ کہ دیانتداری سے اس کام کو انجام دے گا اب اگر واقع میں وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے، یعنی قابلیت رکھتا ہے اور امانت ودیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبے سے اس میدان میں آیا تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے۔ اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدّار اور خائن ہے۔ اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک وملت کے لیے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا۔ پہلے تو وہ خود غدار اور خیانت کا مجرم ہو کر عذاب جہنم کا مستحق بن جائے گا۔ اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کے لیے کھڑا ہوتا ہے اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے اور یہ سب سمجھ لے کہ اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال تک محدود تھی کیونکہ بنص حدیث ہر شخص اپنے اہل وعیال کا بھی ذمہ دار ہے اور اب کسی مجلس کی ممبری

کے بعد جتنی خلق خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ اس کی گردن پر آتا ہے۔ اور وہ دنیا و آخرت میں ذمہ داری کا مسئول اور جواب دہ ہے۔

ووٹ اور ووٹر:

کسی امیدوار کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت اور امانت بھی اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے جو سخت کبیرہ گناہ اور وبال دنیا و آخرت ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کا ذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔ جس حلقے میں چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔

اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے محض رسمی مروت یا کسی طمع وخوف کی وجہ سے اپنے آپ کو وبال میں مبتلا نہ کرے، دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے۔ اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بری سفارش کرتا ہے تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے۔ اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق، ظالم کی سفارش کر کے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے پانچ سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا، ہم اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹر کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق

ہوتی ہے اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا ہے اور اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا ہے مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لیے اگر کسی ناحق کو اپنی نمائندگی کے لیے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے۔ ایک شہادت دوسرے سفارش، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں۔ اسی طرح نا اہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

ضروری تنبیہ:

مذکورالصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے۔ اسی طرح ایک اچھے، نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے۔ قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح سچی شہادت کو واجب و لازم بھی فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط (المائدہ ۵:۸)

''اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوجایا کرو۔''

اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ۔ (النساء ۴:۱۳۵)

''انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لیے گواہی دو۔''

ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لیے ادائیگی شہادت کے واسطے کھڑے ہوجائیں تیسری جگہ سورۂ طلاق میں ارشاد ہے:

واقیموا الشھادۃ للہ (۶۵:۲)

''اللہ کے لیے سچی شہادت کو قائم کرو۔''

سورۂ مائدہ کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے۔

''سچی شہادت کو چھپانا حرام اور گناہ ہے۔''

ولا تکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ اٰثم قلبہ

(سورۃ البقرہ ۲:۲۸۳)

''شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہے۔''

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں۔ ضرور ادا کریں، آج جو خرابیاں انتخاب میں پیش آ رہی ہیں ان کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نیک صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے۔ جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدہ میں آ رہا ہے کہ ووٹ عموماً ان لوگوں کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لیے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ کس قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے اس لیے جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار قابل اور نیک معلوم ہو اسے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی حرام اور پوری قوم وملت پر ظلم کا مترادف ہے اور اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ ہو مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحق ہے جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع نہ کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہا رحم اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔

مختصر یہ کہ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام ہے، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم وعمل اور دیانتداری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے۔ جس کام کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

(۱) آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعے جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا وہ اس سلسلہ میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا ان کی ذمہ داری آپ پر عائد

ہوگی۔ آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے۔

(۲) اس معاملہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے، ثواب بھی عذاب بھی محدود۔ قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

(۳) سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے۔ اس لیے آپ کے حلقہ انتخابات میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل اور دیانتدار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

(۴) جو امیدوار نظریہ اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

(۵) ووٹ کو پیسوں کے معاوضے میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند ٹکوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے۔ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلے میں ہو کوئی دانشمندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسروں کی دنیا کے لیے اپنا دین کھو بیٹھے۔

☆☆☆

غزل

کس سے دل کی بات کہوں میں بیٹھ کے اس ویرانے میں
شمع مری ہمراز نہیں ہے ذوق نہیں پروانے ہیں

شیشے کب سے خالی پڑے ہیں ٹکڑے ٹکڑے ساغر میں
ساون بھادوں کیا برسیں گے دل کے اس میخانے میں

قسمت پھوٹی دنیا کھوئی موسم روٹھا روٹھا سا
دل کا بوجھ کہاں جا پھینکیں درد کے اس ویرانے میں

حسن کی بزم آراستہ کرنا سہل نہیں ، آسان نہیں
بکھرا جائے ہے اک عالم زلفوں کو سلجھانے میں

وقت کی آندھی تیز بہت ہے آؤ شہودؔ اب لوٹ چلیں
وقت کہاں برباد کرو گے شام نہ ہو گھر جانے میں

شہود ہاشمی۔ریاض

اگر تم بیچنا چاہو

اگر تم بیچنا چاہو!
ادائیں بھی، وفائیں بھی، حسین خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی
یہ دنیا ہے، یہاں آواز بکتی ہے، یہاں تصویر بکتی ہے
یہاں پر حرف کی حرمت یہاں تحریر بکتی ہے
یہ بازارِ جہاں اک بیکراں گہرا سمندر ہے
یہاں پر کشتیاں ساحل پہ آ کر ڈوب جاتی ہیں
مسافر مر بھی جاتے ہیں، مگر رونق نہیں جاتی
یہ انسانوں کا جنگل ہے
اور اس جنگل میں منگل کا سماں ہر وقت رہتا ہے
اگر تم بیچنا چاہو
ادائیں بھی، وفائیں بھی حسیں خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی
مرے دل میں بھی اک بازار سجتا ہے
جہاں پر شام ہوتے ہی ہجومِ یاس ہوتا ہے
غموں کی بھیڑ لگتی ہے
کئی یوسف سرِ بازار بکتے ہیں
اگر تم بیچنا چاہو!

اگر تم ڈھونڈنا چاہو

اگر تم ڈھونڈنا چاہو!
تو میں تم کو خزاں آثار بے سایہ درختوں میں ملوں گا
جہاں مہتاب سے محروم راتوں کو خزاں آرام کرتی ہے
جہاں گرتے ہوئے پتوں کے ماتم میں ہوا کا ساز شامل ہے
مری آواز شامل ہے
اگر تم ڈھونڈنا چاہو
تو میں تم کو کسی ویران بستی میں کسی بے آب صحرا میں ملوں گا
کہ میں صحرا کی اڑتی ریت کے ذروں کا حصہ ہوں
کوئی بھولی ہوئی کہانی ہوں کوئی پارینہ قصہ ہوں
کسی دن تم جو آ نکلو
کسی ویران قریے میں کسی ایسے خرابے میں
جہاں کوئی نہیں رہتا
جہاں تاریک راتوں کو خموشی چیخ کر اپنے مکینوں کو بلاتی ہے
اچانک اس خرابے میں
کہیں بیٹھا ہوا دیکھو کسی تنہا مسافر کو
تو پھر اتنا سمجھ لینا کہ تم نے پا لیا مجھ کو
اگر تم ڈھونڈنا چاہو!

کرامت بخاری

شمیم فاطمہ

بہار آ گئی ہے

سنا ہے شگوفوں کے کھلنے کے دن ہیں،
سنا ہے بہاروں نے،
صحن چمن میں قدم رکھ دیے ہیں،
سنا ہے کہ شاخیں سنورنے لگی ہیں
سنا ہے شگوفوں کی اٹھکیلیاں
بڑھ گئی ہیں!!
سنا ہے درختوں کے تن سج گئے ہیں،
سنا ہے سحابوں کی آنکھوں میں کاجل لگا ہے
سنا ہے ہوائیں گلوں کے تقرب سے
عنبر فشاں ہوگئی ہیں!!!
سنا ہے چمن میں بہار آ گئی ہے!
میرے شہر کے بام و در کیوں
اداسی لپیٹے ہوئے ہیں
میرے شہر میں کیوں
خزائیں بسیرا کیے ہیں
میرے شہر کو کیوں اندھیروں نے
گھیرا ہوا ہے

میرا شہر کیوں جل رہا ہے؟
میرے شہر کی آنکھ میں
کیوں نمی ہے؟
میرے شہر کی مانگ کیوں
ایسے اجڑی ہوئی ہے؟
میرے شہر کی فاختائیں
بھلا بین کیوں کر رہی ہیں؟
میرے شہر کی بلبلیں،
آج نوحہ گری کر رہی ہیں!
میرے شہر کی آبیاری پہ مامور
اہل ہنر، میرے مزدور، تاجر، میرے نوجواں
بے وجہ قتل کیوں ہو رہے ہیں؟
بہار آ گئی ہے تو کیوں.....
میرے شہر نگاراں میں
داخل نہیں ہو رہی ہے
بہار آ گئی ہے تو
پھولوں کے دل کیوں بجھے ہیں!!

اب کہہ ڈالو تو بہتر ہے

''گڈو..... پنکی..... اٹھو سکول نہیں جانا کیا!''

عابدہ نے بچوں کے منہ پر سے چادر ہٹاتے ہوئے یاد دلایا اور کپڑے پریس کرنے سائڈ روم میں داخل ہو گئی۔

بمشکل ابھی قمیص ہی استری کر پائی تھی کی بجلی نا مراد غائب ہوگئی.....وہ دوبارہ بچوں کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''سنا نہیں پوستیو! اٹھو گے یا گدھے کی طرح لیٹے رہو گے،سکول جانا ہے۔''اس نے وہ چادر جو بچوں نے دوبارہ منہ پر لے لی تھی کھینچ کر پرے پھینکی۔

دونوں بچے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

''جی،امی.....''

''امی کے لگتے سگتو،سکول نہیں جانا تم لوگوں کو؟''خاصے کڑوے لہجے میں اس نے زہرا گلا۔

''سکو..... و ..... ل'' دونوں کے رنگ فق ہو گئے۔گڈو کا سانس تو اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔

''کیسے سکتہ پڑ گیا ہے سکول کے نام پر، نامراد و سکول لگنے میں صرف چالیس منٹ باقی ہیں۔دو تین چھٹیاں اکٹھی کیا آئیں،سکول جانا ہی بھول گیا۔ حال دیکھو ان بگڑے شہزادوں کا .....'' زبان کے ساتھ اس کے ہاتھ آملیٹ کے پیاز کاٹ رہے تھے۔

دونوں منہ پھاڑ کر جمائیاں لینے لگے تو اس کو اور تپ چڑھ گئی۔''لگاؤں ایک جوتا،یا خود ہی اتر آؤ گے اس مملکت سے.....''اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں سستی سے اٹھے۔مرے مرے انداز میں روتے بسورتے کمرے سے باہر آئے۔

''کیا موت پڑ گئی ہے سکول کے نام پر ابا کے راج دلاروں کو۔ذرا یہ یونیفارم تو پکڑو اور جلدی پاؤں اٹھاؤ.....'' اس نے پنکی کو بازو سے کھینچا اور یونیفارم پکڑایا۔

غصے میں ہاتھ کی گرفت ذرا زور سے پڑ گئی..... سخت لہجہ اور اس سے بھی سخت ہاتھ۔پنکی کی ننھی سی

جان اسے سہار نہ سکی اس کا باجا پنجم سر میں بجنا شروع ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ یونیفارم پھینکتی کرارا زوردار تھپڑ پنکی کے منہ پر پڑا.....

''کس بات کا سوگ منا رہی ہو روکر؟''

ڈر سہم کر گڈو خود ہی غسل خانے میں چلا گیا..... جلدی میں یونیفارم لے جانا بھول گیا۔

''اوئے نواب صاحب کی اولاد یونیفارم کون لے کر جائے گا .....'' اس نے پوری قوت سے حلق پھاڑ کر کہا۔ پیازوں کے کاٹنے کے بعد وہ اپنے بالوں میں جلدی جلدی برش پھیر رہی تھی۔

''گئے کس پر ہو تم دونوں؟ الف بے پڑھنے سے تمھاری جان جاتی ہے۔ سکول کے نام سے تم پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ ہوم ورک سے موت اچھی لگنے لگتی ہے۔ کون کہتا ہے تم پڑھے لکھوں کی اولاد ہو؟ باپ اٹھارویں اور ماں سترھویں گریڈ کی افسر ہے۔ ان پڑھ، جاہل!!''

اندر سے اس کا میاں جاوید آیا اور بغیر کچھ کہے پنکی کا بازو پکڑ کر باہر لے گیا۔ رکشے والے نے چھٹیوں کے بعد زیادہ ہی ''ایفی شینسی'' دکھائی اور رکشہ بیس منٹ پہلے دروازے پر پاں پاں کر رہا تھا۔ وہ ناشتہ جو بچوں نے پیٹ میں انڈیل کر سکول جانا تھا ابھی بننے کے ابتدائی مراحل میں تھا۔

چند منٹ بعد عابدہ نے چائے کا کپ اور آملیٹ سلائس جاوید کے سامنے رکھے ..... پانی کا گلاس اتنی زور سے رکھا کہ آدھا پانی چھلک کر نیچے گر گیا۔

عابدہ کی اپنی ویگن بھی بس دو چار منٹ میں آنے والی تھی۔

''بے چارے بچے'' چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر جاوید نے کہا۔

اس کا ''بے چارے'' کہنا ہی عابدہ کو سلگا گیا۔ وہ کپڑے بدل کر اب تیار تھی۔

''کن کو کہا بے چارے'' وہ تلخی سے بولی۔ ''دنیا جہاں کے نالائق، نکھٹو، پڑھنے سے جان جاتی ہے اور .....''

''ایک منٹ!'' جاوید نے انگلی کے اشارے سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم جانتی ہو مجھے مداخلت بے جا پسند نہیں ہے۔ تم بچوں کو مارو، پیٹو یا پیار کرو ''ماں ہے'' کا رشتہ اور مرتبہ مجھے بولنے سے منع کرتا ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا! مار پیٹ، لاڈ پیار اپنی جگہ پر.....

آئندہ کبھی اپنی گفتگو میں، تمھارے منہ سے میں ''کس پر گئے ہیں''، ''کیسی نسل'' کا فقرہ نہ سنوں ..... آئی سمجھ؟'' سخت تنبیہی لہجے میں اس نے عابدہ کو کہا۔

''مجھے علم ہے کہ تم جاننا چاہتی ہو نہ جاننا چاہو گی لیکن میرے حافظے میں آج بھی تمھارے بچپن کے بچپن ساٹھ واقعات کم از کم موجود ہیں جو تمھارے بچپن میں علم سے کورے ہونے، تمھاری کند ذہنی، تمھارے بھلکڑ پنے سے تعلق رکھتے ہیں ..... اگر تم تھوڑی سی زحمت کرو تو تمھیں بے شمار ایسے واقعات یاد آ جائیں گے جو تمھاری نالائقی اور سست الوجود ہونے کے متعلق ہیں۔ چاچی اللہ بخشے تمھارے کند ذہن، نالائق یا غبی ہونے کے متعلق ایک لفظ نہیں کہتی تھیں ..... اور نہ اسے پسند کرتی تھیں ..... تمھارے حافظے کی تیزی کے لیے سکول سے آتے ہی مالش کرنے بیٹھ جاتی تھیں ..... تمھاری صبح رات کو بھگوئے باداموں کی سات گریاں کھانے سے شروع ہوتی تھی۔ تمھارے دوسری کلاس میں دو مرتبہ فیل ہونے پر بھی ان کے چہرہ پر ایک ناگواری کی لہر نہ آئی تھی۔ اب بھی یاد آیا کہ نہیں .....؟''

انتہائی سفاکانہ انداز میں جاوید نے اس کے بچپن کا پوسٹ مارٹم کیا۔

''اب تم آج آفس سے چھٹی کرو اور سارا دن سوچ کر مجھے جواب دو..... ایسے کیوں ہے؟ اس لیے کہ چاچی جی اللہ بخشے کسی تعلیمی ادارے میں نہیں پڑھی تھیں..... موٹی موٹی کتابوں کو وہ انتہائی ادب احترام سے ہاتھ لگاتی تھیں ..... علم سے محرومی نے ان کے اندر علم کی چاہت اور محبت پیدا کر دی تھی۔ ان کی علم دوستی پورے محلے میں مشہور تھی ..... تمھاری استانیوں سے وہ اتنی محبت کرتی تھیں کس لیے؟ صرف اس لیے کہ وہ ان کی بیٹی کے دل میں علم کا پودا لگا رہی ہیں .....''

خود سوال اور خود ہی جواب دیتے ہوئے وقفہ لے کر جاوید نے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا اور پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھا..... ''تمھیں شاید یہ بھی یاد ہو کہ تمھاری کھیل کود میں دلچسپی اور پڑھائی سے عدم دلچسپی نے ان کے لہجے کو سخت نہیں کیا تھا ..... ان کی نرمی، تمھاری لاپروائی پر دلسوزی میں تبدیل ہو گئی تھی ..... جھاڑ، پھٹکار تو دور کی بات انھوں نے کبھی تمھیں اونچی آواز میں کسی کام سے منع نہیں کیا تھا ..... کس لیے؟؟

محض اس لیے کہ تم علم سے متنفر نہ ہو جاؤ.....اور شاید تمھیں یہ بھی یاد آ جائے کہ وہ تمھارا سکول بیگ اٹھا کر دو کلومیٹر دور تک تمھارے ساتھ جاتیں ..... دوپہر میں لنچ بریک میں تمھاری پسند کی اشیاء خود بنا کر لے جاتی تھیں، سکول سے واپسی پر تمھارا منہ چوم کر تمھارا استقبال کرتی تھیں ..... وہ ان پڑھ ضرور تھیں جاہل نہیں.....

آج بتا دو .....تم ایم ایڈ کر کے جاہلوں کا رویہ کیوں اپنائے ہوئے ہو؟

اور وہ ان پڑھ ہوتے ہوئے ایک مثالی علم دوست کیوں تھیں؟

ان کے پاس ڈگری نہیں تھی، بچے پالنے کا ہنر تھا۔تمھارے پاس ایم ایڈ کی ڈگری ہے بچے پالنے کا ہنر نہیں ..... میں نے تو ان چار سالوں میں تم سے یہی دیکھا ہے یہی سیکھا ہے کہ بچہ علم کے حصول کے لیے نکلے تو جلے بھنے لہجے میں ہی رخصت کرو..... بادام کی گریاں تو دور، تم تو سادہ پانی کا گلاس بھی نہیں دے سکتیں ..... پلیز میری باتوں کا برا مت منانا لیکن اس کی وجہ ضرور تلاش کرنا، وجہ پتہ چل گئی تو اتنا شدید فرق؟؟؟ یہ بھی علم ہو جائے گا.....''

جاوید نے اپنا والٹ اور سیل فون اٹھایا اور اپنا اندر کا جمع شدہ لاوا عابدہ پر انڈیل کر چلا گیا.....رہی عابدہ.....عابدہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے سوالوں کے دائرے بلکہ شکنجے میں تھی جب گیٹ سے جاوید پلٹ کر آیا۔

''میری نصف بہتر.....نمبر ایک میں نے یہ کچھ تمھاری دل آزاری یا تمھیں ہرٹ کرنے کے لیے نہیں کہا، بلکہ آئینہ دکھایا ہے جس کو سامنے رکھ کر تم اپنے اور اپنی امی کے کردار میں واضح فرق محسوس کرو گی.....''

عابدہ کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

''دیکھو پلیز روؤ مت، محاسبہ کرو، واقعی یہ بہت تکلیف دہ عمل ہوتا ہے لیکن میری باتوں کی تہہ تک پہنچو۔سوری ونس اگین'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور گھڑی پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا کر بولا۔

''او.....ہو.....''

''اچھا اللہ حافظ .....'' تیزی سے وہ گھر سے باہر نکلا.....گھر کے اندر کی دنیا طوفانوں کی زد میں تھی۔

یہ سب کیوں ہوا میرے ساتھ؟؟

میں ایسی کیوں ہوں؟؟

میری ملازمت، مہنگائی، ٹینشن، بدلتے رویے .....کس چیز کو موردالزام ٹھہراؤں.....؟؟؟

وہ سارا دن ٹھنڈی آہیں بھرتے، آنسو پونچھتے، کنپٹیاں دباتے اور پینا ڈول کھاتے گزرا۔

اگلی صبح جب وہ اٹھی تو اس کے چہرے پر سکون تھا.....!

اس نے بڑے آرام سے گدگدیاں کر کے بچوں کو اٹھایا.....

بچوں کی پسند کا ناشتہ تیار کیا۔ لطیفے سنائے، ہنستے ہنساتے بچوں کو سکول جانے پر آمادہ کیا۔ لنچ بریک کے لیے شاندار ''فوڈ پیکج'' بچوں کے بیگ میں تھا۔

بچوں کو چھوڑنے گیٹ تک گئی اور ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں الوداع کہا۔ جب تک رکشہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا وہ گیٹ میں کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ جواباً بچے بھی پرجوش ہاتھ لہرا رہے تھے۔ تالیاں پیٹ رہے تھے!!

اسے پتہ ہی نہ چلا کب جاوید نے پیچھے سے آ کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کل کی صبح اور آج کی صبح میں کتنا واضح فرق ہے.....!!''

''ہاں .....'' قدرے پرسکون لہجے میں آہستہ سے عابدہ نے کہا۔ وگرنہ کل سے اس نے چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا۔

''تمھاری ویگن کا وقت ہونے والا ہے..... '' جاوید نے اسے بولنے پر آمادہ کیا۔

''میں نے استعفیٰ بھجوا دیا ہے.....آج بس رسمی کارروائی کے لیے جاؤں گی.....'' منہ موڑے ہوئے اس نے جواب دیا ..... اس کے چہرے پر بڑی شرمندگی والی مسکراہٹ تھی ..... دکھایا گیا ماضی تو خوشگوار نہیں تھا ..... ہاں مستقبل خوشگوار ہو سکتا ہے .....

یہ دونوں کے ذہنوں میں آنے والی مشترکہ سوچ تھی.....

☆☆☆

ڈاکٹر ممتاز عمر

مدہوش

وہ اپنے سارے غم اور فکریں بوتل میں ڈبو دیتا تھا۔ ایک برے شخص کا ماجرا

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گھروں کی کھڑکیوں سے بجلی کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ کسی کسی مکان کے باہر لگا روشن بلب اردگرد کے ماحول میں ایک ہالے کی شکل میں روشنی۔ پھیلا رہا تھا میں گھر سے باہر آیا تو کسی کے سسکنے کی آواز سے چونک کر رک گیا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو چبوترے پر کوئی سایہ سا نظر آیا۔ قریب جا کر پوچھا ''کون؟'' تو ہچکیوں اور سسکیوں میں یہ آواز آئی ''بیٹا! میں ہوں۔'' آواز جانی پہچانی تھی۔ ذہن پر زور دیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو شمسو بھائی کی آواز ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے چپکے چپکے رو رہے تھے۔ ان کی رنگت اتنی سیاہی مائل تھی کہ اگر دیکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو اندھیرے میں سجھائی نہ دے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ملیشیا رنگ کا سوٹ پہنے اندھیرے سے مماثل ہو گئے تھے۔ میں ان کے قریب جا بیٹھا۔ عمر میں وہ میرے بزرگوں کے برابر یا بڑے ہی ہوں گے مگر ہم نے سب سے انھیں شمسو بھائی کہتے سنا تھا اس لیے اسی نام سے پکارتے تھے۔

کاندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے دوران ڈوبتی آواز میں بولے ''میں نے اُسے بھگا دیا اور بڑی سختی کے ساتھ دھکے دے کر یہ کہتے ہوئے کہ دفعان ہو جا اور اگر میرا اصل خون ہے تو مجھے کبھی اپنی صورت نہ دکھانا۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''وہ چلا گیا اور میں بیٹھا اپنے اس عمل پر رو رہا ہوں کیونکہ دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے تو اس کی شکل تک یاد نہ تھی کیونکہ وہ چند ماہ کا تھا جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ آج دیکھا تو وہ مجھ سے کچھ اونچا ہی ہوگا اور صورت بھی ہو بہو میرے جیسی تھی۔ دن بھر اس کی پھوپھی اسے کلیجے سے لگائے بیٹھی رہی۔ جب شام کو میں گھر پہنچا تو خوشی خوشی مجھے اس سے ملایا گیا مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی اور دھکے دے کر نکال دیا۔''

ان کی یہ بات سن کر میں حیرت زدہ ہو رہا، پھر پوچھا ''کون تھا؟ آپ کس کا ذکر کرتے ہیں؟''

وہ بولے۔ ''میرا بیٹا حنیف تھا۔''

''مگر آپ کی شادی، بیوی اور بیٹا.....''

شمسو بھائی اپنی بہن اور بھانجوں کے ساتھ ہمارے گھر سے دو گلی آگے رہتے ہیں کسی بڑے سیٹھ کے یہاں ڈرائیور ہیں اس لیے شام کو جب بھی گھر آتے ہیں ان کا سفید اجلا لباس زیب تن اور ہیٹ ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بس رنگت ہی سیاہ ہے ورنہ وردی پہن کر تو خوب چمکتے ہیں۔ کبھی کبھی گرتے پڑتے آ رہے ہوتے ہیں تو کوئی محلے دار انھیں سہارا دے کر گھر تک چھوڑ آتا ہے۔ مَے نوش ہیں جو تنخواہ پاتے ہیں اس کا کچھ حصہ تو بہن کو دیتے ہیں اور باقی شراب کی نذر ہو جاتا ہے۔ ہمارا گھرانہ اور دیگر بہت سے لوگ ان سے ملنے سے کتراتے ہیں۔ مگر جب وہ پیے ہوئے نہ ہوں تو ہر ایک سے بڑی گرمجوشی اور خوش اخلاقی سے ملتے ہیں اور اس کے پاس آ بیٹھتے ہیں۔ یوں مجبوری میں لوگ ان سے ملتے ہیں۔ وہ ہر ایک کی خوشی اور غم میں بڑے خلوص سے شریک رہتے ہیں۔ شراب نوشی کی وجہ سے دینداری ان کے قریب سے نہیں گزری۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی انھیں مسجد میں دیکھا ہو۔ حد یہ ہے کہ عید اور بقر عید کے موقع پر بھی جب وہ ملنے آتے ہیں تو سب لوگ پوچھتے ہیں کہ نماز کہاں پڑھی؟ کسی کو ادھر اور کسی کو ادھر والی عید گاہ کا بتاتے ہیں۔ ہاں! جب اپنے جیسے بدقماشوں میں بیٹھے ہوں تو ٹھٹھہ مار کر ہنستے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ابے! دیر سے اٹھ کر تیار ہو کر نکلا اور پہلے ملنے والے سے یہ پوچھا کہ تو نے نماز کہاں پڑھی؟ اور اس کی تسلی کے لیے دوسری عید گاہ کا پتہ بتا دیا۔ ارے بھئی وہ بڑا غفور الرحیم ہے بس معاف کر دے گا۔ دیکھو کتنا مہربان ہے۔ کھانے، پہننے اور پینے تک کو دیتا ہے حالانکہ مولوی صاحب تو جنت میں شراب پلائے جانے کا وعدہ کرتے ہیں اور کتنے سیدھے ہیں، تھوڑی سی چکھ کر تو دیکھیں کیا مزہ آتا ہے۔''

ہم نے اپنے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ انھوں نے بھی شمسو بھائی کو یونہی دیکھا ہے۔ ان کی بہن نے گھر میں ایک کمرہ بنوا دیا ہے جس میں یہ صرف سونے کی غرض سے جاتے ہیں ورنہ کھانا پینا تو باہر ہی رہتا ہے۔ ہاں! ہمیں ان کے ساتھ نہ بیٹھنے کی تاکید اور جب بیٹھا دیکھ لیتے تو خواب ڈانٹتے کہ کیوں بیٹھتے ہو؟ حالانکہ ان کی باتیں اتنی لچھے دار اور دلچسپ ہوا کرتی ہیں کہ ہم چھپ چھپا کر ان کے پاس بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ وہ اکثر ایسے واقعات سناتے کہ کس طرح چالاکی سے

اتنے پیسے جمع ہوئے کہ بوتل خرید پائے۔ کبھی بتاتے کہ ''ایک پڑوسی نے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا میں نے بنگلے کا پتہ بتا کر کہا سفارش میں کردوں گا مگر جو کچھ ملے گا آدھا آدھا کرنا ہوگا۔'' ایک بار بتانے لگے کہ ''مالکن کی چھوٹی بیٹی بھی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اس کی ایک پازیب کھل کر گاڑی میں گر گئی۔ جب گاڑی بند کرنے لگا تو چاندی کی پازیب پر نظر پڑی میں نے اٹھا کر ڈیش بورڈ میں رکھ دی۔ دوسرے دن مالکن کہنے لگی ڈرائیور! بچے بڑے بے پرواہیں پتہ نہیں ایک پازیب کہاں گرا دی؟ اور پھر خود ہی کہنے لگیں لو یہ دوسری تم لے لو اپنی بھانجی کو دے دینا اور بھئی اپنے لیے تو عید ہوگئی۔ دونوں پازیب بیچ کر ایک بوتل کے لیے پیسے ہاتھ آ گئے اور پھر جو سرور ملا اس کا کیا کہنا۔'' ایک اور واقعہ سناتے ہوئے بتانے لگے کہ ''سیٹھ کے یہاں شادی ہوئی تو انھوں نے کہا دو کالے مرغ لاؤ، دلہا دلہن پر سے وار کے صدقہ کر دینا۔ میں ایک ٹوکرے میں دو بڑے تندرست مرغ لے آیا۔ دولہا نکلا تو اس کے اوپر سے پہلے مرغ کو گھمایا اور ٹوکرے میں بند کر دیا۔ جب دلہن برآمد ہوئی تو مالکن نے کہا۔ ''ڈرائیور! اب دوسرا والا مرغ دلہن پر سے وار دو۔'' اب اللہ بہتر جانے وہ پہلا تھا یا دوسرا، میں نے ٹوکرے سے نکالا اور اس پر سے گھما پھرا کر ٹوکرے میں بند کر دیا۔ پھر مالکن بولیں۔ انھیں جا کر کسی غریب کو دے دو۔ میں انھیں لے کر چلا اور راستے میں سوچنے لگا بھلا مجھ سے زیادہ ضرورت مند کون ہوگا۔ پھر میں نے جس دکاندار سے لیے تھے اسی کے پاس جا پہنچا اور الٹا اس کے سر ہو لیا۔ ابے کالے مرغ دے دیے نوکری سے نکلوائے گا۔ سیٹھ لوگ کہتے ہیں بدشگونی ہوگئی۔ وہ بولا آپ ہی نے تو مانگے تھے۔ میں نے کہا ابے! میں نے مرغ کہے تھے کالے تو نہیں کہے تھے۔ دکاندار بولا۔ تو اچھا دوسرے لے جاؤ۔ نہیں بے! انھوں نے دوسرے نوکر سے منگوا لیے ہیں اب تو انھیں واپس کر۔ بڑی ردوکد کے بعد چند روپے کم دینے پر آمادہ ہوا اور یوں اپنی بوتل کا انتظام ہوگیا۔''

میں ان ہی خیالات میں گم شمسو بھائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا ''آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟''

بولے: ''کوئی اٹھارہ بیس سال پہلے آپا نے کرا دی تھی۔ اب ہم کہاں پابند رہنے والے ہیں۔ وہ خرچہ مانگتی اور پٹتی تھی۔ شاید ہی کبھی ڈیڑھ سال میں سکھ سے رہی ہو۔ ایک دن میں گھر پہنچا تو نشہ چڑھ چکا تھا۔ اس

نے خرچہ مانگا۔ کہنے لگی بچے کے لیے دودھ نہیں، میں نے اسے مارنا شروع کر یا۔ وہ بولی۔ جب بیوی کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے تو نکاح کیوں کیا تھا؟ آپا بھی درمیان میں آ گئیں مگر میں آپے میں نہ تھا۔ اسے مارتا رہا اور طلاق طلاق کہہ کر گھر سے نکال دیا۔ نہیں پتہ کس کے ساتھ گئی اور کہاں گئی؟ چند دن تو اس کی یاد آئی کیونکہ وہ میرے لیے کپڑے دھو کر رکھتی تھی اور کھانا بھی کھلاتی اور بستر بھی بچھاتی تھی مگر پھر میں بھول بھال گیا۔ نشے کی اس لت نے مجھے کبھی اس بات کو بھی یاد نہ رکھنے دیا کہ جب وہ نکلی تھی تو اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ جب کبھی اس کی یاد آئی بوتل چڑھائی اور غم غلط کیا۔

آج جب گھر پہنچا تو یہ لڑکا آپا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ آپا بولیں: تمھارا بیٹا ہے۔ خون نے قدرتی طور پر جوش مارا، میں اس سے لپٹ کر خوش ہوا، خوب چوما جس سے پریشان ہو کر وہ دور ہونے لگا۔ کیونکہ میرے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ پھر میں نے پوچھا۔ تو یہاں کیسے آیا اور تیری ماں کیسی ہے؟ وہ بولا: ماں نے گھر گھر کام کر کے اور محلے والوں کے کپڑے سی سی کر مجھے پالا۔ پانچ جماعت تک پڑھایا۔ پھر ایک مکینک کی دکان پر لگوا دیا۔ جب میں کام سیکھ چکا تو میں نے اپنا ورکشاپ بنا لیا۔ وہ میرے وقت بے وقت آنے جانے اور برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے پر ناراض ہوتی ہے پرسوں میں سگریٹ پیتا ہوا گھر پہنچا تو اس نے مجھے خوب مارا۔ میں چپ چاپ پٹتا رہا حالانکہ مجھے بڑی بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔ اگلے دن میں نے اپنے ماموں سے جا کر پوچھا کہ میرا باپ کون تھا؟ اور کہاں رہتا تھا؟ انھوں نے یہاں کا پتہ دیا تو آج آپ کو دیکھا ہے۔ اب میں آپ کی خدمت کروں گا، آپ کے قدموں میں رہوں گا اور بس اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ آپ کی خدمت کروں اور ماں کے پاس کبھی نہ جاؤں گا۔ کیونکہ اس نے مجھے آپ کے بارے میں کبھی نہ بتایا تھا اور میں جب بھی پوچھتا کہتی تھی وہ بڑا برا آدمی تھا اور میں تو تمھیں اس کے سائے تک سے بچا کر رکھنا چاہتی ہوں۔ ہاں ابا! تم کتنے اچھے ہو۔ پھپھو نے بتایا ہے کہ ..... ابا کا لفظ سن کر پدرانہ محبت جوش مارنے لگی مگر میں نے ایک بڑا فیصلہ کیا اور نشے کے باوجود بڑے ہوش کے ساتھ چلا کر کہا۔ ابے بے غیرت! جس نے تجھے خون پلا کر پالا، محنت مزدوری کی اسے برا کہتا ہے اور جس نے تجھے اور اُسے کبھی سکھ نہ دیا اس کی محبت کے گیت گاتا ہے۔ نکل جا یہاں سے، میرے

سائے سے دور ہو جا۔ وہ سچ کہتی ہے میں برا آدمی ہوں برا ہوں اور برا رہوں گا۔ تجھ میں اگر ذرا بھی غیرت ہے تو جا کر اُس کے پیروں میں پڑ جا، معافی مانگ اور اس کی خدمت کر۔ میرا کوئی حق تجھ پر نہیں کیونکہ جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو خدمت کیسے لوں؟ ابے! بیوقوف بناتا ہے۔ جس نے وفا کی، اسے چھوڑ کر آتا ہے اور مجھے دھوکے اور فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے دھکے دے دے کر گھر سے نکال دیا اور یہ دیکھنے کہ وہ جا رہا ہے کہ نہیں اس کے پیچھے چلتا رہا، گالیاں دیتا رہا۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس گلی سے مڑا، میری ہمت جواب دے چکی تھی، میں یہاں آن بیٹھا اور رونے لگا۔''

اسی حالت میں روتے روتے انھوں نے پوچھا۔

''تم بتاؤ کیا میں نے صحیح کیا؟''

اور میں سوچنے لگا کہ ہوش میں نہ ہونے کے باوجود اس شخص نے کس قدر ہوش مندی کا ثبوت دیا۔

☆☆☆

امیمہ امجد

بند کھڑکی

میں نے وہ کھڑکی بند ہی دیکھی تھی۔ وہ عجیب کھڑکی تھی، ایک بار دائیں جانب کھلتی اور ایک بار بائیں جانب، نہ جانے کیوں آج میں نے اسے کھولا۔ اُس کے پٹ خستہ حال اور ٹوٹنے کے قریب تھے۔ صدیوں کی مسافت اور گزرتے زمانے نے اُسے دیمک زدہ اور بوڑھا کر دیا تھا۔ کھڑکی کی دائیں جانب بھی ایک دنیا تھی اور بائیں جانب بھی۔ میں نے اندر نظر ڈالی اور دائیں طرف دیکھا۔ یہ محلّہ کچا تھا، ٹوٹی پھوٹی گلی تھی اور خستہ حال گھر، دروازے بس زمین بوس ہونے کو تھے، عجیب دنیا آباد تھی۔ انتہائی زبوں حالی میں بچے ہشاش بشاش کھیل کود میں مگن تھے، دوڑ لگاتے، گرتے، ایک دوسرے کو اٹھاتے، اکٹھے بھاگتے اور اکٹھے جیتتے، لوگوں کے چہروں پر ایک تقدس، ایک وقار تھا، عورتوں کی آنکھوں میں حیا و حجاب نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ کیسا عالم ہے، اوپر سے کتنا تلخ مگر اندر سے لطیف، زندگی سے بھرپور، پھر ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''عبدالعزیز کو گولی لگ گئی ہے، اس کو اٹھاؤ، دوڑو۔''

''ہشام، پھٹا لاؤ۔''

''معاذ، چادر کہاں ہے، چادر ڈالو۔''

عبدالعزیز زمین پر پڑا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں خاک سے اٹے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر پیاس سے پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ہشام، معاذ، مصعب اور حمزہ دوڑتے ہوئے عبدالعزیز کے اردگرد کھڑے ہوئے، معاذ نے عبدالعزیز کی آنکھیں بند کیں، حمزہ نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا، ہشام اور مصعب تب تک پھٹا اٹھا لائے اور عبدالعزیز کو اس پر لٹا کر اٹھا لیا، کہ تب وہ ایک آواز سے چونک گئے۔

''عبدالعزیز، حمزہ، معاذ آجاؤ اب، کھیل ختم کرو، کھانا کھاؤ۔''

عبدالعزیز ہنستا ہوا اس پھٹے سے اٹھ بیٹھا اور سارے کھلکھلاتے ہوئے چل پڑے۔ اچانک فضا میں کچھ مانوس مگر دہشت انگیز آوازیں گونجیں، کچھ جہاز پرواز کرتے ہوئے اوپر سے گزرے اور اس پیاری دنیا پر

آگ کے گولے برسا گئے، ام عبدالعزیز ''یارب'' کہتی ہوئی گھر سے نکلی۔ مٹی اور گرد پھیلتی جا رہی تھی اور ہر طرف بارود کا دھواں تھا، کہیں سے آگ اٹھ رہی تھی اور کہیں سے چیخیں اور آہیں بلند ہو رہی تھیں، ام عبدالعزیز کے پاؤں ایک مانوس کراہ سن کر اس سمت دوڑے، کھیل کے تمام کھلاڑی جیت گئے اور وہ بارود اور آگ کے گولے ہار گئے۔ عبدالعزیز کے ہاتھ میں مصعب کا ہاتھ تھا، ہشام کے سینے سے معاذ لگا تھا، اور حمزہ کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا! میری آنکھوں کے آگے سے بارود ہٹا تو میں نے چیختے ہوئے کھڑکی میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی، میں نے ام عبدالعزیز کو آواز دینے کی کوشش کی کہ کھڑکی دائیں جانب سے اچانک بند کر دی گئی، خون رس رہا تھا اور چیخیں مدھم پڑ رہی تھیں، بائیں جانب سے کھڑکی کھلی اور ایک اور منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا، یہ ایک اونچی عمارت تھی، کئی منزلہ، بلند، شیشوں اور نفیس پتھروں سے بنی ہوئی۔

''مونی، یہ والی رہنے دیں بیٹا۔''

''ماما! یہی لینی ہے، That's it۔''

''اچھا بے بی۔''

کئی کڑکڑاتے نوٹ دکاندار کے ہاتھ میں گئے تو اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''دلاور، سامان اور منیب کے کھلونے گاڑی میں چھوڑ آؤ۔''

پیچھے مونی اور اس کی ماما چلی آ رہی تھیں۔ راستے میں ایک ڈبا دیکھا جس پر کچھ نامانوس سا، عربی میں لکھا تھا اور نیچے انگریزی میں Muslim United Charity لکھا تھا، سوالیہ نظروں سے جب مونی نے ماں کو دیکھا تو انھوں نے ایک ترچھی نگاہ سے اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا دیا۔

مجھے اس حسین عمارت میں کئی مونی اور اس کی ماں نظر آئے، کئی بہت امیر نہیں بھی تھے، مگر اُن کے پاس اس عمارت میں آنے کے لیے رقم تھی، ڈبے میں ڈلتے ۵، ۵ کے سکوں نے گویا میرے دل کا سکوت توڑا اور سکوں کی چھن چھن کی آوازیں میرے ویران دل میں گونج اٹھیں، میری آنکھوں میں کہیں دور تک ویرانی پھیل گئی اور مصعب کے ہاتھ سے وہ پتھر چھوٹ گیا!! میں نے تڑپ کر کھڑکی بند کی، نعشیں اٹھائی جا چکی تھیں، ہشام اور عبدالعزیز خاموش تھے اور مصعب کے ہاتھ سے گرا پتھر ان ۵، ۵ روپے کے سکوں کے درمیان جگمگا رہا تھا، کھڑکی دائیں جانب خود بخود کھل گئی، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور ساتھ ہی ایک مدھر اور معصوم سی ہنسی۔

''فاطمہ، میمونہ، عائشہ، آ جاؤ میرے ساتھ، ابا آنے والے ہوں گے۔''

''جی اماں۔'' کچھ دیر میں دسترخوان بچھ گیا، ایک پروقار اور باریش آدمی نے آ کر اُن تینوں کے سروں پر پیار کیا اور اللہ کا شکر ادا کرتے زمین پر بیٹھ گیا۔

یہ اونچے اونچے چناروں پر ایک لکڑی کا گھر تھا، اونچے درخت اور ان پر برف جمی تھی، اردگرد گھر بھی تھے مگر مکین کم تھے۔ جگہ ویران تھی مگر کئی داستانوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا، ہر گھر میں ایک کہانی تھی اور ہر کہانی میں ایک گھر تھا، عائشہ برتن رکھ کر باورچی خانے سے نکلی تو کچھ بوٹوں کی دھمک نے اُس کے قدم روک لیے، اندر سے اس کو اپنی بہنوں کی آہوں اور اپنے باپ کی پروقار آواز سنائی دی۔ اس کی ماں اور بہنیں کونے میں دبک کر بیٹھی تھیں اور اس کے باپ کو بالوں سے پکڑے، بندوق تانے کسی ''اگروادی'' کا پوچھا جا رہا تھا، کچھ نہ جان پانے کے بعد اُن کی خونخوار نگاہوں کا مرکز وہ معصوم بچیاں بن گئیں، باپ نے گویا بھانپ لیا اور تڑپ کر اٹھا، ایک کی گردن دبوچی اور دوسرے کو گرانے کی کوشش کی، سنسناتی ہوئی گولی آئی اور مردِ آہنگ کے سینے میں پیوست ہوگئی، آسمان کی طرف نظریں کرتے اور اللہ کی پناہ میں اپنی تتلیوں کو دیتے اس نے شہادت کی انگلی اٹھائی، عائشہ اپنی سسکیوں کو دباتے ہاتھ میں چھری دبائے، پیچھے سے لپکی اور پے در پے وار کر کے ایک درندے کو لہولہان کر دیا۔

ماں نے دونوں چھوٹی بچیوں کو دروازے سے باہر دھکیلا اور اپنی لختِ جگر کو بچانے کے لیے لپکی، یکا یک ایک فوجی نے عائشہ کو دبوچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے گاڑی کی سمت لے جانے لگا، وہ چلائی۔

''اماں .....موسیٰ عمر کی بیٹی ہوں میں عزت دار باپ کی عزت دار بیٹی ہوں۔''

اس لڑکی کی مزاحمت نے اس ظالم کو پاگل کر دیا اور پورا ریوالور ایک نازک ہستی پر خالی کر دیا، عائشہ کے ہاتھ گر گئے مگر اس کی مٹھی میں ایک چھری تھی، چناروں کی فضا میں ایک کلمہ گونجا اور ایک اور داستان لہو رقم ہوئی۔ کھڑکی بند ہوگئی۔

میں آہستہ آہستہ بیٹھ رہا تھا، میری ٹانگوں میں گویا جان نہ رہی، اور مجھے ایک خون سے بھرا دوپٹہ فضا میں اڑتا نظر آیا، کچھ لمحوں کے لیے میں جامد ہو گیا جب کھڑکی بائیں جانب کھل گئی۔ ایک بے ہنگم شور بپا تھا، ایک طوفانِ بدتمیزی تھا جو آیا ہوا تھا، عجیب ہیجان کی سی کیفیت تھی اور زیادہ تر اندھیرا تھا، ایسے میں کچھ لوگ مدھم روشنیوں میں

مجھے لچکتے، لہراتے نظر آئے، عجیب حلیے میں کئی لوگ دیکھے، اچانک میری نظر کچھ لوگوں پر پڑی، نہیں معلوم اُن میں لڑکا کون تھا اور لڑکی کون؟

''جیسے چاہو جیو، سنا ہے ناتم نے۔'' ''کھالے، پی لے، یہ لے (قہقہہ) ساتھ ہی ایک بوتل پیش کی گئی، موسیقی کی آواز سے میرے کان پھٹے جارہے تھے۔

''چلو یار، صبح عید بھی ہے، صبح کے فنکشن کی تیاری بھی کرنی ہے۔''

سارا گھر پہنچی اور بلا تکلف صوفے پر دراز ہوگئی۔ ماں کے استفسار کرنے پر یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ ہم چاند رات منا رہے تھے۔ پھر شاپنگ پر تبصرہ چل نکلا۔ ہزاروں کے خریدے گئے کپڑے، جیولری، کچن میں بھرا بے تحاشا سامان اور اس پر شکوہ کناں سارا کی نظریں۔

''یہ کس قسم کا رنگ ہوا؟ میں یہ پہنوں گی؟ ماما، آپ فرینڈز کے سامنے میرا مذاق بنوائیں گی کیا؟'' آخر آدھی رات کو سارا کی پسند کے کپڑے اور سیٹ لائے گئے، عید کے لیے پارٹی اور رات کے کھانے کے انتظامات کرنے کے لیے کچھ مزید نوکر بلوائے گئے۔ وہ کھڑکی بند ہوگئی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون سے میمونہ اور فاطمہ لپٹی بیٹھی تھیں، عائشہ کا خون سے رنگا دوپٹہ فضا میں اڑتے اڑتے ایک درخت میں جا پھنسا اور اس کی مٹھی سے چھری چھوٹ گئی!

شاید اب میری ہمت نہ تھی کہ میں دوبارہ کھڑکی کھولتا، مگر عبدالعزیز کی آنکھوں کی چمک اور عائشہ کی نظروں میں استقامت نے مجھے ہرا دیا، دائیں طرف پھر کھڑکی کھل گئی۔

"Happy Children's Day" سر جوزف نے اندر آتے ہی بچوں کو کہا جس کے جواب میں پر جوش انداز میں تالیاں بجائی گئیں۔ آئزک اور ڈینیئل ہنستے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ سر جوزف نے ان کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

"We are proud of our Children"

سر جوزف یہ کہہ کر آئزک اور ڈینیئل کو لیے باہر آ گئے۔ ''ورلڈ چلڈرن ڈے'' کو منانے کا خوب انتظام کیا گیا تھا۔ ایک سٹیکر اٹھایا گیا اور اس پر چپکا دیا گیا۔ اشارے کے منتظر صیہونیوں نے وہ میزائل چلا دیا اور اس پر لکھا سٹیکر میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

"A gift for Palestenian Kids!"

میری نظریں ان میزائلوں کا تعاقب کرتی رہیں اور غزہ کی سڑکیں خون سے نہا گئیں۔ اگلے دن کی

کامیابی میں ۱۱ بچوں کی لاشیں قطار میں رکھی ہوئی تھیں۔ تین ماہ کی نور سب سے آگے لیٹی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ جب وہ کھڑکی بھی بند ہوگئی۔

''ہم جائیں گے تو کے ایف سی یا میکڈونلڈ۔''

سمیر کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر ماں کی ممتا تڑپ گئی۔

''دیکھو حسیب، اپنے ابو کو سمجھا لو، بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہم کیوں باقی دنیا کی وجہ سے خراب کریں۔ اگر یہ کمپنی یہودیوں کی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور جو لوگ کھانے پینے کی چیزوں پر پابندی لگاتے ہیں ان کو کہو کہ پھر ہمیں اور ہمارے بچوں کو اس کا متبادل بھی دیں جو وہ نہیں دے سکتے۔ آج سمیر کی سالگرہ ہے، میں اُسے ناراض نہیں کروں گی۔ باقی تم جانو اور تمھارے ابو کے فرسودہ خیالات!''

وہاں ساری دنیا ہی گویا جمع تھی، کیا تھا وہاں؟ کچھ جھولے، کھانا، مشروب اور دنیا کا فریب مگر اس کے کاؤنٹر پر جمع ہونے والا ایک ایک پیسہ مجھے ان ۱۱ بچوں کی قبروں میں جاتا محسوس ہوا، جیسے وہ پیسے اُن بے جان معصوموں کو تکلیف دے رہے ہیں، مجھے یوں لگا جیسے اس دنیا کے ہزاروں مسلمان تین ماہ کی نور کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبا رہے ہیں۔ میں نے کرب کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں اور کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے سوچا کاش میں اس کھڑکی کو کبھی نہ کھولتا۔

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں کھڑکی کھلی رکھوں گا، اب آر پار نظر آ رہا تھا، مجھے دو مختلف دنیائیں نظر آ رہی تھیں، ایک سسکتی بلکتی اور دوسری طرف بے حس، ظالم۔ دو حدیں، دو دنیائیں مگر یہ ناگزیر تھا، آپ بھی اپنی کھڑکی کھول لیں۔

بہت سے مصعب، عبدالعزیز، عائشہ، ہشام اور نور اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی اس کھڑکی کو مستقل کھول دے، تاکہ داستانیں کھڑکی سے پرے کہیں گم نہ ہو جائیں۔

☆☆☆

فرحی نعیم

خلش

ایک کہانی..... کتنے ہی گھروں کی..... جہاں خوشیوں اور محبتوں کے پیمانے بدل رہے ہیں

''اچھا ٹھیک ہے۔ ہاں ہاں مطمئن رہو۔'' حمیرا فون پر بیٹے کی ساس یعنی اپنی سمدھن سے بات کر رہی تھیں۔ ''دیکھو میں اس کا جواب تمہیں فوراً تو دے نہیں سکتی ظفر سے مشورہ کر کے ہی بتا سکتی ہوں۔ ہاں ہفتہ تو لگ ہی جائے گا بس جو ہو بہتر ہو۔ اچھا خدا حافظ۔'' انہوں نے ثمینہ کو جواب دیتے ہوئے کہا اور فون رکھ دیا۔ اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں، چہرے سے کچھ فکر مند لگ رہی تھیں۔ ثمینہ کی بات نے ان کو ایک مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ شام کو ظفر گھر آئے تو انہوں نے فوری طور پر ہی ان کی پریشانی کو نوٹ کیا تھا۔

''کیا بات ہے کچھ پریشان ہیں؟'' سلام و دعا کے بعد انہوں نے پہلا سوال ان کی کیفیت کے بارے میں کیا جس میں وہ دوپہر سے مبتلا تھیں۔

''ہاں، نہیں.....'' وہ گڑبڑا گئیں۔

''ہاں بھی اور نہیں بھی، یہ بھلا کیا بات ہوئی۔''

''آپ چائے پی لیں پھر بات کرتے ہیں۔'' وہ کچن میں گھس گئیں اور جتنی دیر میں وہ چائے اور بسکٹ وغیرہ لائیں۔ ظفر بھی فریش ہو گئے تھے۔

''ہاں بھئی اب بتائیں کیا بات ہے؟'' انہوں نے چائے کا مگ منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ثمینہ کا فون آیا تھا۔'' حمیرا نے بات شروع کی۔

''سب خیریت تو ہے نا، ثمینہ بھابھی اور بچے وغیرہ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ آپ خود ہی ان کی خیریت لیتی رہا کریں، زبیر بھائی کے انتقال کے بعد اب ہماری ہی ذمہ داری ہے کہ ان کے گھر کا اور ان کا خیال رکھیں۔ یہ بابر کب کا گیا ہوا ہے وہاں؟'' انہوں نے ایکدم سوال کیا۔

''بس ہمارے ساتھ ہی گیا تھا اس کے بعد تھوڑی گیا آپ بھی عجیب باتیں کر رہے ہیں وہ کبھی پہلے اکیلا نہیں گیا تو اب کیا جائے گا اور اس کا جانا وہ بھی اکیلے بڑا معیوب ہے۔''

''اچھا فون کا کیا کہہ رہی تھیں؟'' ظفر اصل بات یاد کر کے بولے۔

''جی میں کہہ رہی تھی کہ ثمینہ کا فون آیا تھا وہ کچھ پریشان سی لگ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ سویرا کی پڑھائی میں ابھی دو سال باقی ہیں.....''

''ہاں تو اس میں کون سی نئی بات ہے یہ تو ہمیں معلوم ہے۔'' ظفر صاحب نے حمیرا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہی جواب میں نے بھی دیا لیکن نہ جانے کیوں وہ بہت پریشان ہے اور معلوم ہے اس نے کیا کہا؟ وہ کہہ رہی ہے کہ نکاح کر دیں۔'' حمیرا نے میاں کی سوالیہ نظروں کے جواب میں دھماکا خیز خبر سنائی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' وہ سچ مچ حیران ہو گئے۔

''جی! میں تو خود حیران ہو گئی میں نے کہا بھی کہ تم عدت سے نکل جاؤ پھر بات کرتے ہیں لیکن وہ بضد ہے کہ یہ کام اب فوراً ہو جائے۔''

''ابھی بھابھی کو عدت سے نکلنے میں کتنا ٹائم ہے؟''

''تقریباً ڈیڑھ ماہ سے تو اوپر ہے دو مہینے سمجھ لیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جہاں اتنا وقت نکل گیا وہاں یہ ڈیڑھ ماہ اور سہی لیکن بھئی وہ تو اتنا اصرار کر رہی تھی کہ آخر کار مجھے ہار ماننی پڑی میں نے آپ سے مشورہ کرنے کا وقت لیا اس سے جب وہ مطمئن ہوئی۔''

''پھر اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' ظفر بیوی سے ان کی رائے لے رہے تھے۔

''میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اتنی جلدی یہ سب، میں نے تو سوچا تھا کہ ثمینہ کی عدت ختم ہو گی تو بات کرونگی کہ اب شادی کر دیتے ہیں۔ جہاں تک پڑھائی کا سوال ہے تو سویرا شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہے ہماری طرف سے تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ منگنی کو سال سے اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن یہ انہوں نے ایک نئی بات کر دی۔''

''ایسا کرتے ہیں کہ رات کو بابر سے بات کرتے ہیں دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ پھر مشورہ کر کے کچھ سوچتے ہیں۔'' ظفر صاحب نے بات ختم کی۔ اور حمیرا بھی اثبات میں گردن ہلاتی ہوئی چائے کے برتن سمیٹ کر کھڑی ہو گئیں۔

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر ظفر صاحب، بابر سے بات کرنے کی غرض سے لاؤنج میں ہی بیٹھ گئے تھے۔ بابر بھی آ گیا تھا، حمیرا بھی اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

''ہاں تو اب آپ بابر کو بتائیے کہ آج آپ کی ثمینہ بھابھی سے کیا بات ہوئی ہے۔'' ظفر صاحب نے حمیرا سے کہا۔

''سب خیریت تو ہے نا۔'' بابر حیرانی سے دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہاں بیٹا سب خیریت ہے۔'' پھر انہوں نے فون پر ہونے والی بات اور ثمینہ کی گفتگو تفصیل سے بابر کو بتائی۔ بابر بھی ان کا مطالبہ سن کر حیران رہ گیا۔

''اب بیٹا تم بولو کیا کہتے ہو؟'' ظفر صاحب نے گیند اس کے کورٹ میں ڈالی۔

''پہلے آپ دونوں مجھے یہ بتائیں کہ انکا یہ مطالبہ کیسا ہے؟'' بابر کچھ سوچ کر گویا ہوا۔

''بظاہر تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ سویرا اور تمہاری منگنی ہوئے ایک سال ہو چکا ہے اور جیسا کہ انہوں نے منگنی سے پیشتر ہی کہہ دیا تھا کہ شادی سویرا کی پڑھائی مکمل ہونے پر ہی کی جائے گی لہٰذا اس وعدے کے پابند ہیں۔ لیکن زبیر بھائی کی ناگہانی اور المناک موت کی وجہ سے اب ثمینہ پریشان رہنے لگی ہیں۔ چونکہ بیٹا بھی کوئی بڑا نہیں، گھر میں سویرا ہی بڑی ہے اس کے دوسرے بہن بھائی ابھی چھوٹے ہیں لہٰذا ثمینہ نے یہی سوچا کہ کم از کم ایک فرض تو ادا ہو جائے۔'' ظفر صاحب آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

''تو پھر وہ یہ فرض مکمل طور پر ادا کیوں نہیں کر دیتیں میں تو کہتی ہوں کہ اور چند مہینے ٹھہر جائیں شادی ہی کر دیتے ہیں۔'' حمیرا پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے بولیں۔

''آپ خود ہی تو کہہ رہی ہیں وہ صرف نکاح کرنا چاہتی ہیں وہ بھی فوری۔'' ظفر صاحب نے ان کو یاد دہانی کروائی پھر بابر کیطرف متوجہ ہوئے ''تم بھی تو بولو۔''

''بات تو یہی ٹھیک ہے کہ چند مہینے ٹھہر جائیں اور شادی ہی کر لیں لیکن اگر وہ نہیں مانتیں تو پھر یونہی سہی، کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے سویرا تعلیم مکمل کئے بغیر شادی پر راضی نہیں ہوگی۔ آپ لوگ ان سے گھر جا کر بات کر کے دیکھیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مان جائیں۔'' بابر نے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور توقف کر کے بولا ''پھر جیسا آپ مناسب سمجھیں، بہرحال مجھے آپ کے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔'' اس نے سارا معاملہ والدین کے اوپر ہی چھوڑ دیا۔

''خوش رہو، پھر ٹھیک ہے کل چلتے ہیں آپ بات

کر کے دیکھیں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔'' ظفر صاحب اٹھتے ہوئے بولے اور جواب میں حمیرا نے سر ہلا دیا۔

اگلے ہی دن حمیرا نے ثمینہ کو فون پر اطلاع کر دی تھی کہ وہ لوگ شام کو آ رہے ہیں پھر بیٹھ کر اطمینان سے بات ہو جائے گی۔

شام کو جب دونوں میاں بیوی ثمینہ کے ہاں پہنچے تو انہوں نے بھی اپنے بہن بھائی اور نند کو بلایا ہوا تھا۔ پھر یہی طے ہوا کہ اگلے جمعہ کو سادگی سے نکاح کر دیتے ہیں۔ رخصتی سویرا کی پڑھائی مکمل ہونے پر کر دی جائے گی۔ اگرچہ حمیرا نے ایک دفعہ پھر شادی پر زور دیا تھا کہ چھ ماہ بعد نکاح اور رخصتی ساتھ ہی کر دی جائے لیکن ثمینہ نہیں مانی تھیں۔ پھر حمیرا بھی خاموش ہو گئیں۔ اگرچہ وہ بیٹے کی ماں تھیں اپنی بات پر اصرار کر سکتی تھیں لیکن انہیں مناسب نہ لگا پھر دوسری طرف ثمینہ کا یہ کہنا کہ نکاح کے بعد وہ سویرا کی طرف سے بے فکر ہو جائیں گی۔ دوسرا یہ کہ بابر سے ابھی ان کا پردہ ہے۔ داماد کا رشتہ قائم ہونے کے بعد وہ بابر سے بحیثیت بیٹے کے اپنے گھر کے مسائل بھی شیئر کر سکتی ہیں اور پھر ان کا پردہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور وہ ان کا گھر کا ہی فرد بن جائے گا۔ اور یوں حمیرا اور ظفر کو انکی بات تسلیم کرنا ہی پڑی۔ اگلے جمعہ ظفر صاحب اپنی فیملی اور گھر کے قریبی چند مرد حضرات کو لیکر زبیر صاحب کے گھر گئے اور بابر کا نکاح سویرا کے ساتھ کر دیا گیا۔ اور اس طرح ثمینہ کی خواہش پوری کر دی گئی۔ ثمینہ، حمیرا کی بہت شکر گزار تھیں جس کا اظہار وہ بار بار حمیرا سے کر رہی تھیں۔ کہ انہوں نے ان کی خواہش کا احترام کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بابر طبعاً ایک نیک فطرت لڑکا تھا۔ وہ اب والدہ کے ساتھ اکثر ہی سویرا کی طرف جاتا۔ لیکن سوائے سلام و دعا اور خیر خیریت کے ان کے درمیان کچھ زیادہ بات چیت نہ ہوتی۔ دوسری طرف سویرا بھی اس کے سامنے بیٹھتی ضرور لیکن جھجک اور شرم اس کے بھی مانع رہتی۔ بابر اب اسے کبھی کبھی فون بھی کر لیتا کہ شرعاً تو وہ اس کی بیوی تھی لیکن عموماً دونوں میں مختصر بات چیت ہی ہوتی۔ سویرا پچھلے دس منٹ سے موبائل پر میسج کر رہی تھی اس کی دونوں سہیلیاں اس کے پاس بیٹھیں گپیں لگا رہی تھیں۔ اور وہ ہوں ہاں میں ان کو جواب دے رہی تھی۔

''ارے بھئی سویرا یہ تم اتنی دیر سے کس کو میسج پر میسج

کیے جارہی ہو۔ہم باتیں کررہے ہیں اورتم ہو کہ..... یہ آخر کون آ گیا اس وقت۔''اس کی سہیلی ارم بیزاری سے بولی۔

''فرینڈ ہے''سویرا مصروف لہجے میں بولی۔

''یہ کونسی فرینڈ ہے جس کو ہم نہیں جانتے۔''ارم بولی۔

''اوہو تم لوگ بھی..... ارے یہ میری اسکول کی بڑی پرانی دوست ہے شہلا..... بڑے مزیدار میسج کرتی ہے تم بھی پڑھ لو۔''اس نے اپنا سیل ان دونوں کی طرف بڑھادیا۔ارم نے ایک نظر اس ٹیکسٹ میسج پر ڈالی پھر واپس کرتے ہوئے بولی۔

''ہم تو سمجھے تم بابر بھائی کو کررہی ہو جو ہمیں لفٹ ہی نہیں کرارہیں۔''

''تم سوائے ایسی باتوں کے اور سمجھ بھی کیا سکتی ہو۔''سویرا موبائل کو بیگ میں رکھتے ہوئے بولی اور چپس کھانے لگی۔ اس وقت وہ تینوں یونیورسٹی میں تھیں۔فری پیریڈ تھا لہٰذا تینوں اپنی من پسند جگہ پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''یار یہ بابر بھائی تمہارے گھر نہیں آتے؟''اب رخشی پوچھ رہی تھی۔

''آتے ہیں۔''سویرا نے مختصر جواب دیا۔

''تو پھر تم لوگ باہر جاتے ہو گے؟''

''باہر نہیں بھئی بس گھر میں ہی مختصر بات ہو جاتی ہے۔''

''مختصر بات، وہ کیوں؟''وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

''تو امی کے سامنے ہم کیا باتیں کریں؟''اب کے سویرا نے حیرانی سے کہا۔

''ہائیں امی کے سامنے۔''وہ تقریباً چیخی تھی۔

''تم دونوں کیا اب بھی امی کے سامنے..... یار وہ تمہارا دوست نہیں بلکہ شوہر ہے،تم اس کے ساتھ جہاں مرضی جاؤ، باتیں کرو، گھومو پھرو یہ تمہاری امی کہاں سے بیچ میں آ گئیں۔''رخشی آنکھیں پھاڑ کر کہہ رہی تھی۔

''بے وقوف نہ بنو مجھے یہ سب پسند نہیں، نہ مجھے اور نہ ہی بابر کو۔''سویرا مطمئن لہجے میں بولی۔

''بھلا اب ایسا کہاں ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد بھی گھر میں بیٹھ کر باتیں کریں۔''ارم نے کہا۔

''اور وہ بھی مختصر۔''رخشی نے ارم کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور دونوں ہنسنے لگیں۔

''تم لوگ بالکل ہی..... چلو کلاس شروع ہونے کا

ٹائم ہوگیا۔'' سویرا نے دونوں کو غصے سے گھورا اور کلاس کی طرف چل دیں۔

''سویرا'' ارم سموسہ کھاتی سویرا کو مخاطب کیا۔

''تم نے نائٹ کال پیکج تو کروالیا ہوگا؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''کیوں بھئی مجھے کیا ضرورت ہے؟ تم دونوں سے تو روز ملاقات ہوجاتی ہے اور ویسے بھی رات اللہ نے سونے کے لئے آرام کے لئے بنائی ہے۔'' سویرا لاپروائی سے بولی اور کولڈ ڈرنک پینے لگی وہ تینوں اس وقت کینٹین میں بیٹھی بھوک مٹا رہی تھیں۔

''بے وقوف میں اپنی نہیں بلکہ بابر بھائی سے باتیں کرنے کے لیے پوچھ رہی ہوں۔ وہ تم کو کب فون کرتے ہیں؟''

''ہفتہ میں دو تین دفعہ بات ہوجاتی ہے بس اِدھر اُدھر کی۔'' سویرا نے جواب دیا او ردوبارہ سے کولڈ ڈرنک کے گھونٹ بھرنے لگی۔

''روزانہ نہیں کرتیں؟'' اب کے رخشی نے پوچھا۔

''روزانہ کیا باتیں کریں گے؟''

''لو یہ ہم سے پوچھ رہی ہیں، کمال ہے باہر تم لوگ نہیں جاتے، نہ ہی گھومتے پھرتے ہو، حد تو یہ کہ فون پر باتیں نہیں کرتے، تم دونوں تو بڑے بیک ورڈ ہو۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''اور کیا منگنی سے شادی کے درمیان کا پیریڈ تو بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ بڑا رومینٹک اور تم لوگوں کا تو نکاح ہوا ہے۔ اپنی کلاس کی سحرش کو دیکھا ہے اس کا منگیتر کتنا آتا ہے یونیورسٹی اس سے ملنے، پھر ویک اینڈ تو ان کا پکا گھومنے پھرنے کیلئے۔ سنڈے کو الگ جاتے ہیں، ایک تم لوگ ہو، بالکل بور۔'' ارم نے رخشی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید اسے لتاڑا۔

''اس میں بور اور بیک ورڈ ہونے کی کیا بات، اپنا اپنا مزاج اور ماحول کی بات ہے، بابر اور میں اسے مناسب نہیں سمجھتے۔'' سویرا پرسکون لہجے میں بولی۔

''اب تم اتنی بھی خشک مزاج نہیں ہو۔ لگتا ہے یہ تمہارے بابر صاحب ہی ایسے ہیں۔'' رخشی نے چھیڑا۔

''چلو ایسے ہیں تو ایسے ہی سہی۔'' سویرا نے کندھے اچکا کر بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ اور کرسی کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ آج وہ یونیورسٹی آئی تو اپنے

ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں اسے دور سے ہی نظر آ گئیں۔ دونوں نے ہاتھ ہلا کر اسے وہیں بلا لیا تھا۔

''آج سر رضوان کی کلاس نہیں لہٰذا مزے کرو۔''ارم نے سویرا کے پوچھنے سے پہلے ہی اپنے یہاں بیٹھنے کا سبب بتایا۔

''اُف میں اتنا بھاگ کر آئی کہ کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں۔'' وہ بھی سانس درست کرتے ہوئے دونوں کے برابر بیٹھ گئی۔

''اچھا سویرا جلدی سے آنکھیں بند کرو۔''رخشی مسکراتے ہوئے بولی۔''ہائیں، وہ کیوں؟''سویرا حیران ہوئی۔

''تم کرو تو۔''ارم نے بھی اسکی تائید میں بولی۔

''اچھا، چلو کر لیں، اب بولو۔''

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔'' دونوں چلا کر بولیں تو سویرا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اور دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

''کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو، دیکھو سب دیکھ رہے ہیں.....اور تم لوگوں کو میری برتھ ڈے یاد ہے۔'' وہ خوش ہو گئی تھی۔

''بھلا دوستوں کی برتھ ڈے بھی کوئی بھولتا ہے۔ نہ صرف یاد ہے بلکہ یہ لو۔''ارم نے اس کو گلے لگایا اور پھر ایک تحفہ اس کی طرف بڑھایا۔

''ارے یہ کیا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''یہ ہم دونوں کی طرف سے۔''رخشی نے بھی اس گال پر پیار کیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

تب سویرا نے وہ گفٹ جو بڑے خوبصورت طریقے سے پیک کیا گیا تھا اس کا کاغذ پھاڑا اور ڈبے میں سے ایک سوٹ پیس نکالا۔

''واو زبردست۔''سوٹ دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا، ساتھ ہی میچنگ ائیر رنگ تھے۔''بہت شکریہ''

''دوستوں میں کوئی شکریہ نہیں، تمہیں پسند آیا نا؟''ارم مسکرائی۔

''ہاں بہت''اس کی پسندیدگی اس کے لہجے اور انداز سے چھلکتی پڑ رہی تھی۔

''بس اب یہ دیکھتے ہیں کہ بابر بھائی تم کو آج کیا دیتے ہیں؟ اور تم کو کس انداز سے وِش کرتے ہیں۔''رخشی بھوئیں اچکاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اگر وہ خالی خولی تحفہ پر اور کیک پر ٹرخائیں نا تو

صاف صاف کہہ دینا کہ آج تم کہیں باہر جا کر اپنی سالگرہ سلیبریٹ کروگی۔''ارم بھی اسے سبق سکھا رہی تھی جس کے جواب میں وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

اور پھر وہ یونیورسٹی سے آ کر ایک انجانے سے احساس میں گھر گئی۔ نہ جانے وہ بابر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی یا اسکے فون کا۔لیکن اس کی نظریں داخلی دروازے پر لگ گئی تھیں۔ ہر فون کی یا اطلاعی گھنٹی پر وہ بھاگتی لیکن مایوس لوٹتی۔

''پتہ نہیں بابر کو میری سالگرہ کی تاریخ معلوم بھی ہے یا نہیں اور اگر معلوم ہے تو یاد بھی ہے یا.....کم از کم ایک میسج ہی.....''

''افوہ میں بھی'' وہ سوچ سوچ کر تھک گئی اور اسی طرح رات ہوگئی۔ نہ تو بابر آیا اور نہ ہی اس کا فون۔ سالگرہ کو سلیبریٹ کرنے کے لئے باہر جانا تو درکنار اس نے تو وش کرنے کا میسج تک نہیں کیا تھا۔

''اب میں ان دونوں کو کیا جواب دوں گی جب وہ مجھ سے بابر اور اس کے دیئے تحفہ کے بارے میں پوچھیں گی۔''ایک نئی فکر اس کے گرد گھیرا ڈال رہی تھی۔''یہ بابر تو واقعی بہت بیک ورڈ ہیں۔'' آج پہلی دفعہ اس کے دل میں بابر کی طرف سے بال آیا تھا۔

اگلے دن سویرا ان کے متوقع سوالوں سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو کافی مصروف ظاہر کرتی رہی۔فری پیریڈ میں وہ لائبریری چلی گئی۔لیکن وہ دونوں تو ایسا لگتا تھا کہ شاید یہی سب پوچھنے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

''ہاں شام کو بابر آ گئے تھے، میرا پسندیدہ چاکلیٹ چپس کیک لیکر۔''اس نے پہلے سوال کے جواب میں پہلا جھوٹ گھڑا اور پھر اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے کئی جھوٹ بولے۔

''بہت زبردست سا موبائل فون تحفہ میں دیا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔''جب ارم نے تحفہ سے متعلق پوچھا تو اس نے سوچا سمجھا جواب دے دیا تھا۔اور رات بھر وہ ان کے متوقع سوالوں کے جواب ہی تو سوچتی رہی تھی۔

''نہیں باہر نہیں گئے۔ میں نے تم لوگوں کو بتایا تھا کہ ہم دونوں کو ہی یہ سب پسند نہیں۔''رخشی نے جب باہر جانے کا پوچھا تو اس نے فوراً ہی جواب دیا تھا کیونکہ اگر ہاں کہہ دیتی تو پھر وہ کئی سوالوں کی بھرمار کر دیتی۔

''احمق ہو تم! باہر جانے کا اتنا اچھا موقع مس کر دیا۔ یہی تو وقت ہوتا ہے۔ ایک میرا بھائی ہے، اپنی وہ

چوہیاسی منگیتر کو ہر وقت لئے لئے پھرتا ہے۔ باہر جانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ایک آنکھ نہیں بھاتی مجھے وہ رمنا کی بچی۔'' رخشی ناک چڑھا کر بولی۔

''چلو چھوڑو۔'' اس رمنا کا ہماری سویرا سے کیا مقابلہ۔'' ارم نے کہا اور پھر موضوع ہی بدل گیا جس پر سویرا نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

لیکن پھر ایسا اکثر ہونے لگا تھا۔ اپنی کسی ہم جماعت کو اپنے منگیتر کے قصے سناتے، اس کے ساتھ گھومنے پھرنے، اس کی شخصیت، دلچسپ گفتگو کو اپنی باتوں میں اہمیت دینے پر وہ اب کبھی کبھی کڑھنے لگی تھی۔ اسے کے نکاح کا علم صرف اسکی قریبی دو تین سہیلیوں کو ہی تھا باقی کلاس کو صرف اتنا ہی علم تھا کہ وہ ''منگنی شدہ'' ہے۔ لہٰذا کبھی جب کلاس میں اس طرح کا موضوع چھڑتا اور کوئی کلاس فیلو بابر سے متعلق اسی طرح کے کسی دلچسپ واقعے کا پوچھتی تو جواب میں اس کے پاس بتانے کیلئے کوئی خوبصورت یاد نہ ہوتی لہٰذا وہ صرف مسکرا کر موضوع بدلنے کی کوشش کرتی۔ لیکن وہ بھی بڑی گھاگ تھیں تب وہ یہ کہہ کر جان چھڑاتی۔

''میں اپنی ذاتی معاملات کو سب کے درمیان ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتی۔'' وہ یہ کہہ کر اگرچہ ان کے منہ تو بند کر دیتی لیکن اپنے اس دل کا کیا کرتی جہاں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔ اور پھر ایسی کئی گرہیں آنے والے وقت میں پڑتی چلی گئیں۔

''کہیں بابر کے لئے یہ رشتہ زبردستی کا بندھن تو نہیں یا میں اسے پسند بھی ہوں؟'' عجیب عجیب خیالات اس کے گرد گھیرا ڈالتے۔

ایک بے نام سی خلش وہ محسوس کرنے لگی تھی اور پھر اس کی سہیلیوں کی باتیں اس خلش کو مضبوط کرتی چلی گئیں۔ اور اب یہ اکثر ہونے لگا تھا ارم اور رخشی کے درمیان، وہ دونوں موضوع گفتگو بننے لگے تھے۔ بابر کی ''بور شخصیت'' خاص طور پر نشانہ پر رہتی جس کی وجہ سے سویرا الجھن میں مبتلا رہنے لگی تھی۔

''بابر بھائی تو بہت بور ہیں۔ بالکل آؤٹ آف ڈیٹ'' جب وہ دونوں اس طرح کا تبصرہ کرتیں تو وہ جل بھن کر کباب ہو جاتی لیکن گہری دوستیں ہونے کی وجہ سے وہ ان کو زیادہ کچھ کہہ بھی نہ پاتی۔

جو عادات وہ بابر میں پسند کرتی آئی تھی اب وہی اچھائیاں اسکی خامیاں بن گئی تھیں۔ اس کی سوچ میں تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ وہ بابر سے بددل ہو رہی تھی۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہو رہا تھا وہ خود بھی نہیں جان پا رہی

تھی۔اس کا رویہ بابر سے تبدیل ہورہا تھا۔ وہ کبھی گھر آتا تو وہ سامنے آنے میں تامل کرتی،فون پر بھی اب وہ اکھڑی اکھڑی رہتی۔

بابر اس کے اسطرح دامن بچانے پر بھی کبھی کھل کر پوچھ نہ پایا جس سے وہ مزید آزردہ ہوتی۔ فاصلے تھے کہ بڑھتے چلے جارہے تھے۔

''محبت اظہار چاہتی ہے۔''بقول رخشی''جہاں اظہار نہیں وہاں محبت نہیں۔'' یہ اسی کی منطق تھی جس پر پہلے تو وہ بڑا احتجاج کرتی تھی لیکن اب خاموش رہتی اور کہتے ہیں خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

اس کی خلش اب بڑھتے بڑھتے ایک غلط فیصلے کی شکل اختیار کررہی تھی۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کرلیا تھا.....بڑا بدصورت فیصلہ!

''امی مجھے بابر سے خلع چاہیے۔'' کئی دنوں سے دل ودماغ میں جولاوا پک رہا تھا وہ آج باہر آ گیا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟''امی جو اپنے کام میں مصروف تھیں پہلے تو اس کی بات سمجھ نہ پائیں۔اور جب کچھ سمجھیں تو ہڑ بڑا گئی تھیں۔

''مجھے بابر سے علیحدگی چاہیے۔''اب اس نے جما جما کر اپنی بات دہرائی۔

''تم ہوش میں تو ہونا۔امی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اس کی بات سن کر۔

''جی ہاں''اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

''کیوں؟ کس لئے؟ کیا بات ہوگئی؟ بابر میں کیا برائی ہے؟''امی اسے سوال پر سوال کیے جارہی تھیں۔ لیکن سویرا کے پاس بڑے دلائل تھے۔امی کی نظر میں اگرچہ وہ سب کے سب بودے تھے لیکن اس کے مضبوط لہجے سے وہ اپنے حواس کھو رہی تھیں لیکن یقین نہ آرہا تھا کہ یہی وہ سویرا ہے۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے؟تم ایسی تو نہ تھیں۔''امی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔''چندا مجھے بتاؤ اصل بات،آخر ہوا کیا ہے؟ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ ہم اطمینان سے بات کریں گے۔ بابر سے کوئی شکایت ہے یا کسی اور سے تو بھی.....''انہوں نے کتنی ہی دفعہ اسے پیار سے،غصہ سے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ تو کچھ سننے کی روادار ہی نہ تھی۔

''یہ میرا حق ہے، میں عاقل وبالغ ہوں اپنا شرعی اور قانونی حق مانگ رہی ہوں۔''اس سے باغیانہ لب ولہجہ سے امی ڈھے گئیں۔

''کاش تمہارے باپ زندہ ہوتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ یاد رکھو سویرا تم ہیرے کو ٹھوکر مار رہی ہو۔''امی نے تھک ہار کر آخری دفعہ کہا تھا۔

''آپ کو اپنی بیٹی سے زیادہ وہ شخص.....''

''ہاں کیونکہ میں نے لوگوں کو تم سے زیادہ پرکھا ہے''لیکن وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔امی نے بابر کے گھر بات کرنے سے پہلے اسے ایک آخری بار اور سوچنے کا موقع دیا تھا لیکن وہ تو خود غرض ہو چکی تھی۔آخر کار امی اس کی ضد اور باغیانہ روش کے آگے نہ چاہتے ہوئے بھی مجبور ہوگئیں او روہ بابر کی ''بور شخصیت'' سے خلاصی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

چند دن تو اس کے بڑے سکون سے گزرے اسے لگا کہ وہ کسی قید سے آزاد اور ہلکی پھلکی ہو چکی ہے۔بابر کے حوالے سے جو جو طنزیہ جملے سننے کو ملتے تھے۔اگر چہ وہ اپنے طور پر تو اس سے نجات حاصل کر چکی تھی۔ سوائے اپنی ان دونوں سہیلیوں کے اس نے کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔جس پر ان کا تبصرہ بڑا مختلف تھا۔دونوں نے پہلے تو اسکی بات سن کر ششدر رہ گئی تھیں پھر پہلے ارم بولی۔

''یہ تم نے کیا کیا سویرا؟تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''ارم کی بات سن کر سویرا حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

''نہیں تم نے بالکل درست فیصلہ کیا، بلکہ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ۔''رخشی نے ارم کو جھٹلا کر بڑے یقین سے کہا تو سویرا جو ارم کے کہنے پر حیران تھی۔یکدم مطمئن ہوگئی۔ اس کے بعد ارم بھی کچھ نہ بولی۔اور اسطرح آئندہ کے لئے یہ باب بند ہوگیا۔لیکن اسے لگا کہ ارم کو اس کے اس فیصلہ سے افسوس ضرور ہوا کیونکہ وہ اس کی دوست تھی اور کم از کم اسے سویرا سے اس انتہائی فیصلہ کی توقع نہ تھی۔ لیکن دوسری طرف رخشی نے اسے اس کے اقدام پر اسکی دلیری پر شاباشی دی تھی۔جو کچھ بھی تھا کم از کم اب وہ اور بابر موضوع گفتگو نہ ہوتے اور اس کے لئے یہی بڑی بات تھی۔

☆.....☆.....☆

اس بات کو بھی اب کئی مہینے گزر چکے تھے۔بظاہر وہ مطمئن تھی لیکن اندر ایک بے کلی سی تھی جو اسے بے چین رکھتی۔امی نے اور چھوٹے بہن بھائی نے بھی اس سے بات کرنی کم کر دی تھی۔ سب جیسے کھنچے کھنچے رہتے۔اس نے بھی ایسے ظاہر کر رکھا تھا جیسے اسے بھی

کسی کی پروانہیں ہے لیکن یہ کیسی کیفیت تھی جو وہ اپنی بات منوا کر بھی دل سے خوش نہ تھی۔

''یہ میری زندگی ہے او راپنی زندگی کے فیصلے کرنے میں، میں خود مختار ہوں مجھے کسی کی پروانہیں۔ آئی ڈونٹ کیئر۔'' جب بے چینی زیادہ بڑھتی تو وہ بار بار اپنے آپ سے یہ جملے کہتی اور جیسے اپنے دل کو مطمئن کرتی۔ لیکن بجائے مطمئن ہونے کے وہ مزید بے کل ہوجاتی۔ پھر اس نے اسکا حل یہ سوچا کہ وہ پڑھائی کے علاوہ دوسری مصروفیات میں مشغول ہوگئی تا کہ بیکار کی سوچیں اس پر حاوی نہ ہوں۔ لیکن بہت جلد اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کا ذہن اور جسم دونوں ہی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھانے سے انکاری ہیں۔ ضرورت سے زیادہ مصروف رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بیمار ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس امی لے گئیں تو ڈاکٹر نے اسے آرام کا مشورہ دیا کہ وہ شدید ذہنی دباؤ کا بھی شکار تھی اور اس کے لئے سخت آرام کی ضرورت ہے۔ امی تو سچ مچ گھبرا گئی تھیں۔ ڈاکٹر سویرا سے اس ڈیپریشن کی وجہ پوچھ رہا تھا لیکن وہ اصل بات چھپا رہی تھی آخر کار اس نے دوائیاں وغیرہ دے کر رخصت کر دیا۔ لیکن یہ دوائیاں اس کی بے چینی اور بے قراری کا حل نہیں تھیں۔

''سویرا آخر کیا بات ہے، میری جان مجھے بتاؤ تم کو کیا پریشانی ہے؟'' امی اس کے پاس بیٹھی اس کو بولنے پر اپنی اندر کی بات کہنے پر اکسا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ بیٹی کا دکھ اس کی بیماری ان سے سہی نہیں جا رہی تھی۔

''امی، امی.....''

''ہاں، ہاں بولو''

''امی میں بہت شرمندہ ہوں بہت پشیمان۔ میں نے بہت برا کیا، آپ کو دکھ دیا، بابر کو دکھ دیا، سب کو تکلیف دی، اب مجھے بدل مل رہا ہے۔ امی میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہیں نکل جاؤں بہت دور، کہیں ایسی جگہ جہاں مجھے سکون مل جائے۔ میری سوچیں مجھے چین نہیں لینے دیتیں۔ میں میں.....''

وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن ہچکیوں نے اس سے اور کچھ کہنے نہیں دیا۔ اور امی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے پاس بھی اب کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ تسلی دلاسے کے الفاظ شاید کہیں گم ہوگئے تھے۔ پچھتاوے کے آنسو سویرا کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں سے بھی بہنے لگے۔

☆☆☆

دل کا دیا

وہ پتھر کے بیوپاری کی بیٹی تھی اور یہ ایک مسیحا کی اولاد.....ساتھ چلتے چلتے اس کی روح زخمی ہونے لگی تھی!

میز پر موبائل کتنی مدت سے وائبریٹ ہو کر کتنے چکر کھا چکا تھا۔ اسے قطعاً کوئی احساس نہ تھا، شیشے سے بنی دیوار کے اس پار شہر جیسے دھند کی آغوش میں سمٹا نظر آ رہا تھا۔ گیارہویں منزل سے نظر آنے والے اس نظارے میں قرب و جوار کی عمارتوں سے پھوٹتی روشنیاں سبطین عباسی کو ان جگنوؤں کی طرح لگ رہی تھیں جو دور وہ اپنے دیس میں کبھی کا چھوڑ آیا تھا۔

چھوڑ تو وہ بہت کچھ آیا تھا، اتنا کچھ کہ بہت کچھ ملنے کے بعد بھی پیچھے چھوڑے گئے کی تشنگی اسے ہمیشہ ہی رہتی تھی۔

وہ محض دو سو گز پر بنے مکان میں امی ابو اور چار بہن بھائیوں سمیت رہتا تھا۔ دونوں بہنوں کی شادیوں کے بعد ابو نے مکان کی چھت پر منزل بڑھا کر شاہین کی شادی کر دی تو وہ اوپر چلا گیا مگر سبطین کا کمرہ نیچے ہی رہا .....زمین کے ساتھ جڑا! چپس کے بنے فرش پر لکڑی کا ایک قدیمی بیڈ اور قدیمی الماری، سبطین کے دادا دادی کے زمانے کا فرنیچر.....ذہن کے کسی گوشے میں دو پروقار سی ہستیاں مدھم مدھم سی موجود تھیں جنھیں دادا جان اور دادی جان کہا جاتا تھا، پھر ایک دن جب سب ان کے گھر جمع ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ خالد عباسی کا انتقال ہو گیا ہے، ابو نے اسے بتایا تھا کہ دادا جان کی طرح ہر انسان کو دنیا میں کچھ عرصہ کے لیے بھیجا جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے واپس بلا لیتے ہیں۔ پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا میں اس کے کئے گئے کام کیسے تھے۔ ابو شاید اور بھی کچھ اس کی تسلی کے لیے بتاتے لیکن وہ بے ساختہ بول اٹھا۔ ''پھر تو ابو! دادا جان کے سارے کام اچھے ہی ہیں۔''

ابو نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ بے ساختہ اس کو سینے سے لگا لیا تھا۔ ''میرے بیٹے دعا کرو کہ اللہ جی اپنی رحمت سے ان کاموں کو قبول کر لیں۔''

ابو کی یہ بات سبطین کو سمجھ آئی ہو یا نہیں، لیکن اس کی پانچ سالہ عمر میں زندگی اور موت کا فلسفہ باپ نے بڑے آسان لفظوں میں اسے سمجھا دیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ زندگی کو ہر صورت اچھے کاموں میں گزارنا ہے۔ پھر غم اس کے لیے کبھی پہاڑ نہ بنے۔ اسے ہمیشہ یہ یاد رہا

کہ زندگی بس اچھے کاموں کے لیے دی گئی ہے اور غم کرنا کوئی اچھا کام نہیں، پرامید رہنا اچھا کام ہے۔ ابو جی سے زیادہ آسان اور شفیق استاد زندگی کا فلسفہ سکھانے کے لیے اسے کوئی نہیں ملا۔ امی جی تو ایسا سانچہ تھیں جو میاں سے تعلق کی اس سطح پر تھیں جہاں محبت، عقیدت میں بدلنے لگتی ہے۔ انھوں نے اپنے گھر کے مرد حاکم دیکھے تھے جن کے منہ سے اڑتے شراروں سے خواتین کو ہر وقت دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔ محبت کا ٹھنڈا میٹھا جھرنا مرد میں سے بھی بہہ سکتا ہے، یہ انھوں نے سسرال آ کر ہی دیکھا اور پھر وہ پلٹ کر دیکھنا بھول گئیں۔

چاروں بچوں میں لہجے کی حلاوت انسان دوستی اور خیرخواہی طارق عباسی اور منزہ عباسی کی تربیت تھی۔ طارق عباسی نے بھی یہ ورثہ میں پایا تھا۔ روشن روشن موٹی موٹی سرمئی آنکھوں والی اماں جان کمال کی ہنرمند خاتون تھیں لیکن بات بات پر اتنے دل سے الحمدللہ کہتی تھیں کہ بچپن میں طارق عباسی نے اماں سے بے ساختہ پوچھا تھا ''اماں کیا آپ کو خود کچھ نہیں آتا جو آپ اتنا شکریہ اللہ میاں کہتی ہیں؟''

الحمدللہ کو دل کی دھڑکنوں کے ساتھ رواں رکھنے کے لیے انھوں نے بیٹے کو ننھی سی عمر میں بتایا تھا کہ یہ اللہ کا شکریہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ ماں نے طارق کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے آنکھیں بند کر کے سامنے بنے طاق سے کچھ سامان لانے کو کہا تھا۔ طارق نے سوال کرنے کے بجائے اماں کی اس فرمائش پر خاموشی سے عمل کیا مگر وہ قریب رکھے موڑھے سے ٹکرا کر لڑھک ہی جاتے کہ بند آنکھوں سے دنیا تاریک تھی مگر اماں جی نے انھیں بڑے پیار سے تھام لیا۔ ہاتھ میں تھاما سامان دور جا کر گرا مگر وہ خود گرنے سے بچ گئے۔

''الحمدللہ تمھیں چوٹ نہیں لگی۔'' اماں جی نے پھر الحمدللہ کہا تھا۔ طارق ٹکر ٹکر ماں کا منہ دیکھنے لگا۔ ساٹھ باسٹھ برس قبل کی نسلیں بڑوں سے زیادہ سوال جواب نہ کرتی تھیں، جو کہا مان لیا۔ نہ بھی مانا تو زبان خاموش رکھی۔ وقت اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے اخلاقی اور تمدن کی حالت میں تغیر ڈالا اور لحاظ و ادب ناپید ہوتا چلا گیا۔ پھر اماں جی نے طارق کو آنکھیں بخشنے والے منعم کی عظمت کا جو احساس دلایا تو پھر اس نے کبھی یہ نہ پوچھا کہ ہر بات الحمدللہ کیوں ہے۔ اماں جی کی آنکھیں بند کروانے سے یہ سمجھ گئے تھے کہ انسان جو کچھ بھی کر پاتا ہے وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے بل پر ہی کرتا ہے، پھر اکڑ کس بات کی، غرور کاہے کا اور اتراہٹ کیوں؟ سب کچھ محض ''الحمدللہ''

ہے۔

طارق ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنے، شفایابی ان کی دی گئی دوا میں جیسے رکھ دی گئی تھی۔ لیکن ان کے الحمدللہ نے ان کو کسی بھی کروفر سے محفوظ رکھا۔ نہ ان کے سر پر سونے کا تاج سجا اور نہ محل بنا لیکن الحمدللہ کی برکتیں خوب ملیں۔ پر سکون دل، محبت سے لبریز گھرانا اور لوگوں کی والہانہ عقیدت۔

اسی طارق عباسی کا بیٹا سبطین عباسی جس نے اپنے باپ سے غم نہ کرنے کا سبق دیکھا تھا ٹورنٹو کی عمارت کی گیارہویں منزل سے نیچے دیکھتا ہوا غم کی لہریں اپنے اندر گردش کرتا ہوا پا رہا تھا۔ کوئی عام نظر اس کو دیکھتی تو کوئی غم اس کے پاس موجود نہ پاتی۔ کوئی سطحی ذہن اس کو سوچتا تو وہ سبطین عباسی، خوش قسمت شخص لگتا۔ کتنے ہی دل اس کی طرح قسمت کی دیوی مہربان ہونے کی تمنا کرتے، لیکن وہ شیشے کے پار دیکھتا نہ جانے کہاں گم تھا۔

اس کے خوبصورت فرنشڈ فلیٹ میں ہر طرف خاموشی تھی۔ بالکل ایسی جیسے اس کے اندر پھیلی تھی۔ گردن کے پچھلے حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنے اندر تھکان اترتی محسوس کی۔ زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہنے سے انسان اضطرابی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے زمین کو اتنی اونچائی سے دیکھنے کی کوشش کی مگر زمین بہت دور تھی شاید..... اسے واضح دکھائی نہ دے رہی تھی۔ ''کیا اصل سے میرا تعلق ٹوٹ چکا ہے؟'' اس نے بے اختیار سوچا، آج وہ واقعی یاسیت زدہ تھا، وہ ایسا تو نہ تھا تو کیا محض ان آشنا دو کالی آنکھوں نے اس کی کیمسٹری میں تبدیلی کر دی تھی؟ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ زندگی میں اتنے تیز رفتار مقام پر وہ معصوم بھولا بھالا سا چہرہ جسے وہ کہیں اپنے طور بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا، اسے ایسے ملے گا کہ بہت کچھ پانے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو تہی داماں محسوس کرنے لگے گا۔ اپنی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی جہاں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس کی بیوی شبینہ ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہ لوٹی تھی۔ یقیناً لائبریری کے کسی کونے میں بیٹھی کتابوں کے ساتھ مصروف ہوگی۔ اس کا سیل فون بھی بند جا رہا تھا۔

وہ ایسی ہی تھی ..... پوری دنیا سے پڑھتے وقت رابطہ منقطع کر دینے والی..... اسے نہ جانے کتابوں سے محبت تھی یا کتابیں پڑھ کر اپنا تاثر بنانے سے یا پھر کیریئر بنانے سے ..... جو بھی کچھ تھا یہ حقیقت تھی کہ وہ اٹل

ارادوں والی شخصیت تھی یعنی اس نے دس برس قبل اپنے اردگرد بسنے والے قریبی رشتوں ناتوں کی توقعات کے برخلاف، سبطین عباسی کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا تھا۔ ان دونوں کی معاشرتی درجہ بندی بظاہر اس قدر مختلف تھی کہ سبطین عباسی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ شبینہ نعیمی جیسے خاندان کی کسی عورت سے اس کی شادی ہوسکتی ہے اور یہ حقیقت پسندانہ سوچ تھی جس نے سبطین کو شبینہ کا التفات محسوس کرنے کے باوجود اس کا جواب دینے سے باز رکھا گو وہ کوئی صوفی منش جوان نہ تھا کہ عمر کے رنگین اور مہکتے جذبات اسے ستاتے نہ ہوں، لیکن جڑوں میں اتری تربیت ایسی تھی کہ رحمت ایزدی کے طفیل وہ ان پر قابو پا جاتا تھا۔

ماس کمیونی کیشن میں ماسٹرز کے بعد وہ کسی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ کمپنی سے منسلک ہو چکا تھا جو مختلف ڈاکو منٹریز بنا کر پرائیویٹ ٹی وی چینلز کو فروخت کرتی تھی۔ ڈاکومنٹری بنانے سے قبل بہت ریسرچ بھی کرنی پڑتی تھی۔ سبطین اسی سلسلے میں مواد جمع کرنے اکثر لائبریری کے چکر لگاتا تھا۔ گو یہ کوئی عمدہ لائبریری نہ تھی مگر شہر میں موجود دو چار میں کچھ بہتر تھی۔ کچھ یہاں سے مدد ملتی اور کچھ انٹرنیٹ سے۔ انٹرنیٹ میں موجود مواد کی درستگی کا ثبوت ملنا ایک کٹھن کام ہوتا ہے، اس لیے سبطین کی کوشش ہوتی تھی کہ کتابوں سے یہ کام ہو جائے، اسے کیا علم تھا کہ کتابوں سے یہ رشتہ وہاں باقاعدگی سے آنے والی شفیع نعیمی کی بیٹی شبینہ کو ایسا بھا جائے گا کہ وہ اپنے ماربل فیکٹری کے مالک باپ سے اپنی شادی کی بات خود کرلے گی۔

شفیع نعیمی کی فیکٹری میں کانوں سے نکلے ہوئے طرح طرح کے خام پتھر جب مختلف مراحل سے گزر کر مخصوص شکل و ہیئت میں ڈھل جاتے تو ان کی قیمت کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہوتی۔ اور پھر برستا ہن شفیع نعیمی کے گھر کو دنیا کی نت نئی جہتوں سے متعارف کرواتا۔ چار بیٹیوں اور ایک بیٹے میں سے صرف شبینہ نعیمی ہی تھی جس نے اپنے باپ کے لفظوں میں بہت ہی عام سا پتھر پسند کیا تھا۔

''اس کی تو اصل ہی قیمتی نہیں، تمھارے ساتھ جڑ کر بھی بے قیمت ہی رہے گا۔''

انھوں نے اس کو اس کی پسند پر ٹوکا تھا لیکن رکاوٹ نہ ڈالی تھی۔

''شبینہ نعیمی نے سبطین میں دیکھا کیا ہے آخر؟'' گھر والے حیران تھے۔

شبینہ کو اپنے خاندانی مزاج کے مطابق کسی کو صفائیاں دینے کی عادت نہ تھی۔ چاہے وہ صحیح ہوتی یا غلط لیکن اپنے عمل اور پسند کی وجوہات بتانے کے وہ لوگ عادی نہ تھے۔

یہ خود پسندی کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے جس پر بقیہ زینہ انحصار کرتا ہے۔

اس زینہ کے کسی حصہ میں کھڑی شبینہ نعیمی نے اپنے گھر کے معاملات سبطین عباسی کے سلسلے میں تقریباً طے ہی کر لیے تھے جبکہ سبطین عباسی کے فرشتوں کو بھی نہ پتا تھا کہ اس کے حوالے سے کون کیا کیا سوچ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شبینہ کو یقین تھا کہ وہ ایک ایسا طاقتور سیارہ ہے جس کے گرد سبطین عباسی نے بالآخر چاند کی طرح گھومنا ہے۔ اس کی مرضی اور اس کا ارادہ سیارے کے تابع ہے۔ کیا وہ اتنے بے اختیار کو اپنی زندگی کے ساتھ جوڑنا چاہتی تھی۔ یہ بات شبینہ نعیمی کو دیکھ کر سمجھ نہ آتی تھی۔ اسے تو اپنے جیسے مضبوط اور باکمال لوگ پسند تھے، وہ خود میڈیکل یونیورسٹی میں انتظامی امور کے شعبہ میں کام کرنے کے ساتھ جینٹکس میں پی ایچ ڈی کے لیے باہر جانے کی لگن میں تھی۔ مسلسل دو سال سے اس کی درخواست مسترد ہوتی آ رہی تھی۔ کینیڈا کی کسی بھی معیاری یونیورسٹی کا پروفیسر اس کی فائل پی ایچ ڈی کے لیے منظور نہیں کر رہا تھا۔ کسی اور جگہ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ خواہش بے شک اس کی تھی مگر بار بار کی ناکامی نے اس کو دل گرفتہ سا کر دیا تھا۔ ایسے میں اس کی ساری حسیات سبطین عباسی کی جانب منتقل ہو گئی تھیں۔ اس کی نفسیات جیت چاہتی تھی۔ جہاں اس کا بس چل سکا، اس میدان میں ہدف سبطین عباسی تھا، جو پہلے شبینہ نعیمی سے خاصا کترایا لیکن بہرحال بتدریج اس کی مزاحمت کمزور پڑتی چلی گئی۔ ہدف کا رہر لحاظ سے طاقتور تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا توانا کھڑے درخت کے سائے میں اگا نرم سا گھاس کا ہرا تنکا..... اپنے قد سے کھڑا بھی ہو تو اتنے عظیم جثّے کے آگے اس کی حقیقت ہی کیا ہوتی ہے۔ پھر شبینہ نعیمی میں خرابی تھی بھی کیا..... ہر طبقہ کی اپنی خوبیاں اور خرابیاں ہوتی ہیں۔ شبینہ نعیمی میں بظاہر یہ ہی مختلف تھا کہ وہ سبطین عباسی کے اردگرد کی خواتین کی طرح اوڑھ لپیٹ کر گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی مگر کشش اتنی زیادہ تھی کہ مزاحمت کے ختم ہوتے ہی سبطین کو دل میں کھٹکنے والا یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا۔

شبینہ کے ساتھ نے اس کو ان لوگوں سے متعارف کروایا جو معاشرے میں مدوجزر بناتے تھے ان جگہوں پر

قدم رکھوائے جہاں کی رعنائیاں دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔ گو وہ کوئی واجبی سی تعلیم اور واجبی سے شعبہ سے منسلک نوجوان نہ تھا لیکن جس دنیا سے شبینہ کے ذریعے وہ متعارف ہوا وہ وہاں تک شاید اس وقت پہنچتا جب اس کی کنپٹیوں پہ بال سفید ہو چکے ہوتے۔ اس کو یہ سب پانے کی کوئی ایسی خاص عجلت بھی نہ تھی لیکن اصل بات یہ تھی کہ شبینہ نعیمی اس کو پسند کر چکی تھی۔ سو اس کی کرم نوازیاں اس پر اس ہنر سے برسیں کہ وہ بالآخر سر تسلیم خم کر ہی گیا۔

اس کا ساتھ شبینہ کے لیے بڑا ہی مبارک ثابت ہوا۔ جس دن سبطین کے گھر والوں نے شبینہ کے گھر کے وسیع لان میں جھل مل کرتی تقریب میں اس کی نسبت شبینہ کے ساتھ طے کی، اس کے اگلے دن ہی شبینہ کا سالوں سے اٹکا ایڈمشن یونیورسٹی میں ہو گیا۔ شبینہ کی پسندیدگی سبطین کے لیے کچھ اور بڑھ گئی۔

''ڈیڈی اب آپ کیا کہتے ہیں کیسا پتھر ہے سبطین؟''

اس نے کھنکتی آواز میں اپنے باپ سے پوچھا تھا۔ شفیع نعیمی نے مسکراتی نگاہوں سے اپنی ذہین بیٹی کو دیکھا جسے خوش قسمتی سے پارس مل گیا تھا۔ بہت جلد ہی ان کی رائے سبطین کے بارے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ سبطین سے پورے تین برس بڑی تھی۔ ایسا نہ تھا کہ عمر کا یہ فرق افسانوی کرداروں کی طرح نظر نہ آتا تھا مگر جب وہ راضی تھا تو ان کو کیا اعتراض ہوتا!

شبینہ نے سبطین پر اپنی پسند ناپسند مسلط کرنے کی قطعاً کوشش نہ کی اور نہ ہی اس کی پسند میں ڈھلنے کا روایتی انداز اپنایا۔ وہ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کرتی تھی۔ شادی اور ولیمہ کی تقریبات کے معیار میں فرق نے سب پر ہی عباسی اور نعیمی فیملی کے معیارات واضح کر دیے تھے۔ سب ہی جان گئے تھے کہ کچھ دل کی لگی کا معاملہ ہے ورنہ شبینہ کے لیے تہمینہ کے دیور کا رشتہ ہر لحاظ سے موزوں تھا، تہمینہ شبینہ کی بڑی بہن تھی۔ اس کی سسرال نے شبینہ کے رشتے کے لیے بہت اصرار کیا تھا۔ اتنا عرصہ وہ لوگ کوشش کرتے رہے کہ کتنے ہی لوگ اس بات کو جان گئے تھے کہ نعیمی صاحب کی خود سر بیٹی منع کر دیتی ہے۔ معاشرہ عریانیت اور فحاشی کے سہارے کتنا بھی اپنے آپ کو مہذب اور ترقی پسند کہلوائے، اصل آزادی عورت کو کبھی نہیں دینا چاہتا۔ رائے کی آزادی، سوچ کی آزادی، یہ سب تو پیارے نبیؐ کی تعلیمات کی برکتیں عطا کرتی ہیں۔ سو شبینہ کا انکار بھی اس پر خود سر ہونے کا لیبل لگا چکا تھا۔ اب سبطین کے ساتھ شادی نے لوگوں سے یہ نتیجہ اخذ کرایا

کہ اس شادی میں کچھ بھی متوازن نہیں اور غیر متوازن معاملات کبھی کامیاب نہیں رہتے۔

نعیمی صاحب کو بہرحال طارق عباسی پسند آئے تھے۔ سلجھے ہوئے نفیس سے بےلوث انسان، سبطین بھی ان کا پرتو تھا، سو تمام تر معیارات انھوں نے اس بنا پر ہی نظر انداز کر دیے تھے ورنہ جھک کر ملنا نعیمی صاحب میں نہ تھا۔ شاید فضل ربی کی ریل پیل نے ان سے یہ فضل چھین لیا تھا کہ وہ لدے ہوئے درخت کی طرح جھک جائیں۔ مگر طارق عباسی کے خاندان کے لیے ان کا رویہ مختلف تھا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ شبینہ کے حوالے سے ان کے حلقہ احباب کا حصہ بن گئے تھے اور اپنی ہر چیز کو وہ اہمیت دینے کے عادی تھے۔

شادی ہو کر شبینہ اسی مکان میں آئی جہاں سبطین رہتا تھا، وہی دو سو گز کا مکان جہاں کی نچلی منزل پر طارق عباسی، ان کی بیوی اور سبطین تھے اور اوپری منزل بڑے بیٹے شاہین کے پاس تھی جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ شبینہ کے آنے سے یہ ہوا کہ طارق عباسی اور ان کی بیوی نے غیر محسوس انداز میں اپنا وقت اوپری منزل پر گزارنا شروع کر دیا۔ شبینہ کے بہت سے طور طریقے اپنے طبقے کے لحاظ سے تھے۔ دن رات کا ساتھ کسی بھی بدمزگی کو باآسانی جنم دے سکتا تھا۔ گھر کا کام کاج کرنا اس کے نزدیک برا نہ تھا لیکن وہ خود اس کی قطعاً عادی نہ تھی۔ اس نے کام کروائے تھے، کام کیے نہ تھے۔ یہ سب سبطین کے گھر میں اختلاف پیدا کر سکتا تھا لیکن حقیقت کو سبطین اور اس کے والدین نے خاموشی سے قبول کر لیا تھا۔ وہ اپنے طور ان سب کا دھیان بھی رکھتی تھی مگر اس دھیان رکھنے کے بعد وہ اپنے خول میں واپس چلی جاتی جہاں سبطین کے علاوہ کسی دوسرے کو اس گھر میں اسے مخاطب کرنے کی جسارت نہ ہوتی۔

سبطین کے گھر والے نرم خو لوگ تھے اس لیے شبینہ اور ان کا ساتھ اس گھر میں کسی فساد کے بغیر چلتا رہا۔ اس کا ایڈمشن کینیڈا کی یونیورسٹی میں ہو چکا تھا اور وہ دن رات اپنے کاغذات کے ساتھ سبطین کو بھی کینیڈا لے جانے کی کوشش میں مصروف ہوگئی تھی۔ طارق عباسی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے بیٹے کو ملک سے باہر جانے دیں جہاں وہ اذان کی آواز سننے سے بھی محروم ہو جائے۔ دنیا کی زندگی کتنی بھی طویل ہو، دوسری زندگی کے عیش کے لیے اس زندگی میں کیش اگر محدود بھی ملے تو سودا نفع بخش ہے، لیکن اگر یہاں کی کمائی کرنسی قبر میں جاتے ہی بیکار ہوگئی تو اس سے بڑھ کر خسارہ کوئی نہیں۔

شبینہ کا ارادہ وہاں پڑھ کر واپس آنے کا نہیں تھا، وہ ادھر ہی رہنا بسنا چاہتی تھی۔ بدامنی اور فسادزدہ ملک سے دور۔ یہ خواہش بلاشبہ جائز تھی لیکن ادھر بھی فساد کی کمی تو نہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ فساد روح میں ابھرتا ہے، اس کو بے کل اور مضطرب رکھتا ہے۔ اخلاقی قدروں کو کھوکھلا کر چکا ہے۔ خدا اور بندے کا تعلق برائے نام کر چکا ہے۔ انسانی روح سسک رہی ہے مگر اس فساد کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ جن کے پاس ہے وہ بگٹٹ انہی فسادزدہ علاقوں کی طرف جا کر انہی کے تمدن کو گلے لگا کر انہی جیسے ہو جاتے ہیں۔ طارق عباسی یہ سوچ سکتے تھے، کہہ نہیں سکتے تھے کہ باگیں بہو کے ہاتھ میں تھیں اور وہ جانے کے لیے کس قدر پرعزم تھی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

جس شام شبینہ خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ ڈھیر کھانے پینے کے لوازمات لیے گھر میں داخل ہوئی، اس شام نہ جانے کیوں سبطین کا چہرہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ شاید اسے بھرپور یقین تھا کہ اس کے کینیڈا اوزٹ کے لیے تیار کاغذات میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور نکل آئے گا کہ شبینہ ان کو ادھورا چھوڑ کر یونیورسٹی جوائن کرنے کے لیے خود ہی اکیلی روانہ ہو جائے گی۔ وہ ملک سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ اگر وہ چلا گیا تو لوٹ کر آنے کے امکانات صفر ہیں۔ وزٹ اور پھر مستقل رہائش ہی اس کی بیوی کے ارادے میں شامل ہے۔ اگر وہ خود گئی تو لامحالہ اسے واپس آنا ہی پڑے گا۔ بہرحال وہ سبطین کو اہمیت دیتی تھی۔

شبینہ کی روانگی تک سبطین کے ویزے کا پروسس شروع ہو چکا تھا۔ ساری بھاگ دوڑ اس نے خود کی تھی۔ بس جہاں سبطین کی موجودگی ناگزیر تھی وہ وہاں اس کو ساتھ لے کر گئی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اس کی وارڈ روب میں اس کی متوقع ضروریات کی کتنی ہی چیزیں ڈھیروں کی تعداد میں رکھ کر گئی تھی۔ کتنی ہی طرح کے برانڈڈ کپڑے جس میں دیسی بھی تھے اور بدیسی بھی۔ عام روزمرہ استعمال کے بھی تھے اور پر تکلف دعوتوں کے، مختلف جوتے، بیلٹس، پرفیومز، نیا موبائل سیٹ اور کئی چیزیں ..... ایئرپورٹ جانے سے پہلے سبطین کو کھڑے کھڑے وہ یہ سب دکھاتے ہوئے بہت نارمل تھی جبکہ سبطین کو اس کی کمی اس کی موجودگی ہی میں محسوس ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا، بہت محبت کرنے والا اور بہت خیال رکھنے والا۔

وہ بھی ایسی ہی تھی ..... بالکل سبطین جیسی ..... وہ کون؟ بادامی آنکھوں والی سبطین کی خالہ زاد، اس کی

مخروطی انگلیوں میں جیسے جادو بھرا تھا، رنگ اور برش کے استعمال کا ہنر اسے خوب آتا تھا، وہ تصویریں پینٹ کرتی تھی، مہکتے گنگناتے پھولوں کی، رم جھم برستی بارش کی، قوسِ قزح کی اور طرح طرح کی ..... اس نے سبطین سے محبت کو بھی پینٹ کرنا چاہا تھا۔ شاید ایسا ہو جاتا اگر شبینہ کی نگاہِ انتخاب سبطین پر نہ ہوتی۔ یہ محبت مجسم بن ہی جاتی لیکن دھنک نام کی دھنک سی لڑکی کی آنکھ کی پتلی پر جو عکس بڑی چاہت سے ٹھہرا تھا وہ پانی بن کر کناروں سے ٹپک پڑا۔

سبطین کو اس کی چاہت کا احساس تھا لیکن اس معاملے میں وہ بے قصور تھا۔ شبینہ کی عنایتیں بڑی زور آور تھیں..... بلند و بانگ، جبکہ دھنک کی پسند میں بہت خاموشی تھی۔ نہ کوئی ہلچل نہ کوئی نغمگی ..... سو میدان شبینہ نے مار لیا۔ اس دن سے دھنک نے رنگ اور برش چھوڑ دیے۔ یہ بات کوئی جانتا ہو یا نہیں سبطین بخوبی جانتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی مداوا نہ تھا۔

شبینہ کی گاڑی ڈرائیو کر کے گھر لاتے ہوئے وہ مستقل بیوی کو یاد کر رہا تھا۔ اس کے مخصوص کولون کی مہک دھیمی سی گاڑی میں موجود تھی۔ سبطین عباسی کے دل میں اس کی بڑی قدر تھی۔ کیسے اس نے اپنے معیار کے برخلاف اس کے چھوٹے سے گھر میں ڈیڑھ سال بخوشی گزار دیا۔ ہاں گاڑی اس کی اتنی ہی شاندار تھی جتنی شاندار ہونی چاہیے تھی۔ سبطین کو بھی سسرال کی طرف سے شادی کے تحائف میں ۱۸۰۰ سی سی کی گاڑی دی گئی تھی جو آج کل اس کے زیر استعمال تھی۔ شبینہ کو اندازہ تھا کہ سبطین کس حد تک کی نوازشات قبول کر سکتا ہے۔ سو اس نے اپنا معیار وہی رکھا جو وہ چاہتی تھی، سوائے اس کے کہ وہ خصوصی لوگوں کی رہائش گاہ سے نکل کر عمومی لوگوں کے مکان میں آ گئی تھی۔ اس کی عمومیت اس لحاظ سے خصوصیت تھی کہ سبطین کے گھر والوں نے خود بخود اس کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو اس پر اٹھتی، کوئی آواز نہ تھی جو اس کو ''نہ'' کہتی۔ سبطین کے بھائی کی بیوی کو چاہے یہ بات کتنی ہی کھٹکتی کہ شبینہ ہر رسم و رواج کی پابندی سے کلی آزاد ہے..... یکسر بے نیاز ہے..... کون آتا ہے، کون جاتا ہے، کس سے مراسم سسرال کے حوالے سے رکھنے ہیں۔ اسے ان سب سے نہ دلچسپی تھی اور نہ مطلب۔ وہ میٹھی زبان میں سبطین کے گھر والوں سے بات کرتی لیکن فاصلہ رکھ کر۔ ذاتی زندگی میں مداخلت اسے پسند نہ تھی۔ اور سب نے بہت جلد بنا کسی تلخ جملوں کے تبادلے کے یہ جان لیا تھا اور اس کے اور

اپنے درمیان حد بندی بھی بنالی تھی۔ وہ انسان ہی تھے اور انسانی نفسیات طاقت اور اختیارات سے متاثر ہوتی ہی ہے۔

شبینہ کے ساتھ یہ دونوں جڑے تھے اس نے گاہے بہ گاہے اپنی طاقت اور اپنے اختیارات سے سبطین کے گھر والوں کو فیض بھی پہنچایا تھا۔ ساس کی آنکھ کا آپریشن جتنی سہولت اور جلدی سے نمٹا، اس میں شبینہ کا ہی دخل تھا۔ طارق عباسی میٹھا کھانے کے بہت شوقین اور شبینہ آئے دن ابا جی کے لیے وافر مقدار میں آئس کریم لاتی۔ مختلف اسٹورز کے ممبر شپ کارڈ پر خریداری کر کے، نندوں جٹھانی کو تحفے تحائف بھی دیے۔ بچوں کے لیے گراں ترین قیمت کی کتابیں خرید کر دیں جن سے شاید وہ کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ وہ شبینہ چاچی کا تحفہ تھیں۔ سبطین گھر میں ہوتا اور شاہین کو کبھی وہ گھر سے باہر پیدل جاتا دیکھتی تو سبطین سے بھائی کو گاڑی میں لے جانے کا کہتی۔ ایسی کوئی خدمت بے شک اس نے کبھی خود ایک آدھ بار سے زیادہ نہ کی لیکن یہ خوبی تھی اس کی کہ سبطین کو کبھی نہ روکا۔ مجموعی طور پر وہ اچھی تھی مگر دونوں خاندانوں کے درمیان کی درجہ بندی کا فرق تھا، جو شبینہ کے ہر انداز میں رچا تھا۔ جو بات شبینہ کے لیے ایٹی کیٹس میں آتی تھی وہ طارق عباسی کے گھرانے کے لیے لیے دیے انداز تھے۔ وہ دو مختلف Density کے مائع کے مانند فریق تھے لیکن پھر بھی بنا کسی ہنگامہ کے ڈیڑھ سال گزر ہی گیا اور وہ چلی گئی۔

کسی اور کو کیسا لگا؟ سبطین کی بہنوں نے ہلکا پھلکا سانس لیا کہ اب میکہ آ کر بچوں کے ہنگامہ کرنے پر ان کا ذہن نہ الجھے گا کہ شبینہ کو نہیں پسند..... وہ آرام سے باتیں کر سکیں گی کہ اب کوئی نہیں جس کے چہرے پر نا پسندیدگی کی کوئی لہر چاہے ایک لمحہ کے آنی ہو وہ دیکھیں، ہاں فارم ہاؤس پر پکنک نہ ہو سکے گی یہ بات اپنی جگہ تھی۔

لیکن سبطین کو اس کے بغیر گھر بڑا ہی بے رونق لگ رہا تھا۔ اس نے سبطین کو اپنا عادی بنا دیا تھا۔ لوگ کہتے تھے سبطین ڈیشنگ ہو گیا ہے۔ شبینہ نے اس کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ سبطین اکثر سوچتا تھا کہ آخر شبینہ نے اس میں کیا ایسا دیکھا تھا جو راجکماری کی طرح نادیدہ سوئمبر میں اس کو ہار پہنا دیا تھا۔ نہ وہ راجکمار تھا ہاں اس کے سامنے وہ راجکماری ضرور تھی۔ وہ جب بھی اس سے یہ پوچھتا تو وہ ہنس دیتی۔

''قرعہ ڈالا تھا شادی کے لیے تمھارا نام نکل آیا۔''

سبطین کی آنکھیں سوالیہ ہی رہتیں اور وہ اپنے کام

میں مگن ہو جاتی۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا۔

''کتابوں سے تمھاری محبت نے مجھے تم سے متاثر کر دیا تھا۔ مجھے لگا تھا تم جیسے ہی مجھے سوٹ کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ پھر سے کسی کتاب کو پڑھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ سبطین دیر تک اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا مگر نہ جانے وہ کب تک پڑھتی رہی اور وہ سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو سرہانے ڈھیروں موتیا کے تازہ پھول رکھے تھے۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو سبطین کو مسحور کرنے لگی۔ وہ حیران تھا کہ یہ پھول کہاں سے آئے۔ شبینہ اسی لمحے مسکراتی ہوئی نظر آئی۔

''اٹھ جاؤ ناشتہ تیار ہے، ساتھ کر لو مجھے جلدی جانا ہے۔''

سبطین نے مٹھی بھر پھول اس کی طرف اچھال دیے تو وہ کھلکھلا کر کمرے سے نکل گئی۔ پھول کہاں سے آئے؟ سوال رہ گیا۔

ابلے انڈے اور کارن فلیکس کا ناشتہ کرتے ہوئے شبینہ کی لگاوٹ بھری باتیں اسے ایسے ہی مخمور کر رہی تھیں جیسے آنکھ کھلتے ہی وہ پھول..... ''تمھارا دماغی کام ہے، اچھا ناشتہ کرو تا کہ توانائی لگا سکو۔'' انڈا چھیل کر چھری سے ٹکڑے کرتے ہوئے اس نے نرم سی آواز میں سبطین کو ابھارا جو صرف کارن فلیکس پر گزارا کرنے کے ارادے میں تھا۔

''اچھا آملیٹ بنا دوں اگر یہ نہیں کھانا۔'' اس نے سبطین کو ہاتھ نہ بڑھاتے دیکھ کر ایک اور آفر کی۔

''ہاں پلیز۔'' سبطین کی آنکھوں میں شرارت ابھر آئی جسے وہ جان کر ہنس پڑی۔

''ٹھیک ہے تم یہ کھالو میں آملیٹ لاتی ہوں۔'' پھرتی سے وہ کچن کی طرف پلٹی۔

اسی طرح وہ سبطین کے ساتھ ہر معاملے میں التفات کا رویہ رکھتی تھی۔ اگر کبھی سبطین کو دھنک سے کوئی لگاؤ تھا بھی تو وہ کبھی کا مٹ چکا تھا۔ شبینہ ہر لحاظ سے اس کے لیے بہتر ہی تھی۔ کتنے ہی عمدہ مشورے سبطین کے پروفیشن کے معاملہ میں اس نے دیے تھے۔ ایسا کچھ دھنک کر ہی نہ پائی۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی کم فہم تھی بلکہ دنیا کی مختلف جہتیں دریافت کرنے کے لیے، ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چاہے وہ طاقت پیسے کی ہو یا تعلقات کی، تیسری دنیا کے لوگوں کے لیے سب سے اہم پیسہ کی طاقت ہے، پیسہ ہے تو تعلیم، پیسہ ہے تو صحت، پیسہ ہے تو انصاف، پیسہ ہے تو رشتہ..... ایسے میں دھنک کا شبینہ سے موازنہ کرنا

ہی فضول تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے خالی گھر کو دیکھا۔ فجر کی اذانیں اردگرد کی مسجدوں سے ابھر رہی تھیں۔ شادی کے بعد اس کی فجر اکثر گھر میں ادا ہونے لگی تھی۔ شبینہ نمازوں کی عادی نہ تھی، کبھی پڑھ لی کبھی نہ پڑھی۔ کوئی نہ تھا جو سبطین کو ''اللہ اکبر'' کی آواز پر بیدار کرتا اور ''حی الصلوٰۃ'' کی پکار پر مسجد جانے پر ابھارتا۔ سو ہفتے میں بمشکل ہی اس کو نماز با جماعت کی سعادت ملتی۔ اکثر وہ جمع شدہ قضا نمازیں پڑھنے لگا۔ ابو جی کی نگاہیں روز ہی سبطین کو فجر کی نماز میں تلاش کرتیں۔ پہلی صف جو کہ اکلوتی ہی ہوتی تھی مسجد میں فجر کے لیے، اس میں کھڑے چار پانچ لوگوں میں کچھ ہی عرصہ پہلے تک سبطین اکثر ہی موجود ہوتا تھا۔ اب نہ تھا۔ طارق عباسی کے دل سے آہ سی نکلتی۔ انھوں نے اپنی اولاد کی تربیت پر خوب محنت کی تھی۔ سبطین ان کی آنکھوں کی صحیح معنوں میں ٹھنڈک تھا۔ بیٹیاں اور شاہین بھی اپنے رنگ ڈھنگ سے ان کو خوش کر دیتے تھے لیکن اس بیٹے کی دوسروں کی خاطر اپنے آپ کو تج دینے کی ادا ان کو بہت ہی بھاتی تھی۔ انھیں لگتا جیسے وہ اپنی دادی کا پرتو ہے، انسانوں کو فیض پہچانے کے لیے اپنے آرام کو قربان کر نے والا، ان سے محبت اور بھلائی کا رشتہ رکھ کر کسی بھی ستائش سے بے نیاز.....

یہ تھا سبطین.....اور سبطین کی بیوی تھی شبینہ! دنیاوی اسرار و رموز سے آشنا لائق فائق انسان، جس کے ساتھ نے سبطین کو نت نئی جہتوں سے متعارف کروایا۔ کتنی ہی کامیابیاں اس نے حاصل کیں صرف سال بھر میں اس کی بنائی دو فلمیں نیشنل ایوارڈ کے لیے نامزد ہو گئیں۔ کمپنی نے اس کو ترقی دے دی۔ ایک بھرپور عمدہ تعاون سے منزہ عباسی کا آپریشن بہت ہی عمدگی سے ہو گیا۔ کھویا کیا پھر سبطین نے؟ بس یہ کہ زندگی میں اترا تازہ بہ تازہ عکس پرانے تصورات پر چھاتا نظر آنے لگا۔ باغ و بہار کے سے مناظر ابھر آئے مگر حقیقتاً نہ وہ باغ تھے اور نہ بہار۔ زندگی کے اصول و مقاصد اور عملی اجزا جو بڑی دلسوزی اور محنت سے طارق عباسی نے سبطین اور اپنے تمام بچوں کے ذہنوں میں نقش کرنے چاہے تھے، وہ جیسے سبطین پر ان کو مدھم ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔

ابھی تو ابتدا تھی مگر ان کی آنکھ بہت آگے کی تصویر دیکھ رہی تھی جہاں مبالغہ آمیز تصورات کی گرہیں لگنی شروع ہو جاتی ہیں اور انسان بے قید آزادی کو جائز سمجھنے لگتا ہے۔

کیا میری تربیت اتنی کچی تھی یا میری اولاد ہی ناقص ہے؟ بوجھل دل کے ساتھ سوچتے ہوئے ان کی نگاہ فجر کی نماز کے بعد دعا کے لیے پھیلائے گئے ہاتھوں سے اوپر آسمان پر ٹک گئی۔ صبح کا دھیما دھیما اجالا پھیل رہا تھا۔ شاہین باپ کو رب سے راز و نیاز میں مصروف دیکھ کر گھر جا چکا تھا۔ انھوں نے آہستگی سے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا بس وہ تھے اور ان کا رب۔ ایک بار پھر انھوں نے پھیلے ہاتھوں پر نگاہ جما کر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ شبینہ گزری رات ایئرپورٹ جانے سے قبل ان کو حکمت پر بڑی نایاب کتاب کا تحفہ دے کر گئی تھی۔ انھوں نے اس کے نماز کے سے انداز میں اوڑھے گئے دوپٹہ پر نگاہ ڈالتے یہ سوچا تھا کہ یہ ساس سسر کے احترام کے بجائے خود اختیاری ہوتی تو بہت کچھ بھلائیاں اور برکتیں مل جاتیں۔ بڑے ادب اور لگاوٹ سے روایتی الوداعی جملے بولتے ہوئے شبینہ واقعی کچھ اداس سی محسوس ہو رہی تھی۔ منزہ نے گلے لگا کر اسے پیار کیا۔

''ڈیڈی کا ڈرائیور گاڑی آ جائے گی اگر آپ لوگ ایئرپورٹ چلنا چاہیں، سبطین میری گاڑی ڈرائیو کر لیں گے۔'' اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے اردگرد دیکھا۔ شاہین ابھی کمرے میں داخل ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ان کی بیوی بچے بھی تھے۔ شبینہ نے مسکراتی نظروں سے سب کو دیکھا اور پھر نپے تلے الوداعی جملے ان سے بھی کیے۔

''رات تین بجے مجھے ایئرپورٹ کے لیے نکلنا ہے بیکار آپ لوگوں کو زحمت ہوگی۔ میں نے سوچا ابھی سب سے ملاقات کر لوں۔ سبطین بہنوں کے ہاں چلنے کو کہہ رہے تھے۔'' اس نے شاہین کی چھوٹی سی بیٹی وردہ کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے بتایا اور اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی جو رات کے نو بجا رہی تھی۔ شاہین کے دونوں بڑے بیٹے جو چاچی کو ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے تیار تھے، چاچی کے کمرے سے باہر جانے کے بعد باپ سے اس موضوع پر بات کرنے لگے تو ماں نے ان کو روک دیا۔ شاہین نے ابرو اچکا کر بیوی کو دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے دیکھا نہیں اس نے بلاواسطہ کیسے ''نہ جانے'' کا کہا ہے.....'' ''آپ کو زحمت ہوگی'' کہہ کر مراد یہ کہنا تھا کہ آپ کے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

شاہین کی بیوی واقعی اس کو سمجھ چکی تھی۔ شبینہ کو سسرالی جھمگٹا ایئرپورٹ پر لگانے کا کوئی شوق نہ تھا جبکہ بچوں کو اپنے گھر میں آئی گاڑی میں چاچی کو

ایئرپورٹ چھوڑنے جانے کا شوق ولولہ انگیز لگ رہا تھا۔ شاہین نے اپنے کسی عزیز سے اس کی استعمال شدہ گاڑی خریدی تھی۔ ایک ہی گھر میں اوپر نیچے رہتے ہوئے شبینہ اور سبطین کی گاڑیوں کی موجودگی نے عجیب سی صورتحال کر دی تھی، جبکہ خود ان میں کسی کے پاس چار پہیوں کی سواری نہ تھی۔ شاہین کا گاڑی لینا اپنی فیملی میں شبینہ سے مرعوبیت کو مزید بڑھنے سے روکنا تھا۔ گو اس کی خریدی گئی گاڑی اور بھائی بھاوج کی گاڑیوں میں کوئی موازنہ نہ تھا لیکن ہونا نہ ہونے سے بہت زیادہ بہتر ہو گیا تھا۔ گو شبینہ یا سبطین کے کسی بھی رویہ سے کبھی خودنمائی ظاہر نہ ہوئی تھی لیکن شاہین کے اپنے احساسات مختلف سے ہو جاتے تھے جب سبطین کبھی بچوں کو گاڑی میں اسکول چھوڑ آتا یا اس کو فیملی کے ساتھ موٹر سائیکل پر جاتا دیکھ کر وہ اٹھ جاتا اور گاڑی کی چابی آگے بڑھا دیتا۔ اس کو شبینہ کے ساتھ سبطین کی شادی اور پھر اتنے قریب رہائش خاصا بوجھ محسوس ہوتی تھی۔ جس نے ان سب کے سبطین کے ساتھ تعلق میں فاصلہ کر دیا تھا۔ ان کو اپنا بھائی، بھائی کم شبینہ کا شوہر زیادہ لگنے لگا تھا۔ حالانکہ سبطین کے کسی بھی رویہ کی بنیاد پر وہ ایسا نہ کہہ سکتے تھے۔ لیکن یہ احساسات تھے جو شبینہ کے فاصلہ رکھنے والے مزاج نے پیدا کر دیے تھے۔ وہ گری ہوئی فطرت نہ رکھتی تھی لیکن نفسیاتی طور پر اسے اپنی اور اپنے بیک گراؤنڈ کی برتری کا واضح احساس تھا جو اسے سبطین کے گھر والوں میں گھلنے ملنے سے باز رکھتا تھا۔ ان کی ہر سوچ اسے محدود اور ہر پسند اسے روایتی لگتی۔ ان کی باتیں عام سی لگتیں۔ وہ سبطین جو گھر بھر کا ہر دلعزیز و محبوب تھا، اب اجنبی سا لگتا تھا۔ وہ سب عام سی خریداری کرتے تھے، سبطین کی خریداری بڑی خاص ہوتی تھی جو کہ شبینہ کے ہاتھوں ہوتی۔ وہ آپس میں بہن بھائی ایک دوسرے کے ساتھ ہلکی پھلکی نوک جھونک کرتے ہنستے مگر سبطین جب شبینہ کے ساتھ ہوتا تو بڑے لیے دیے انداز میں بات کرتا، بڑے رکھ رکھاؤ اور تمیز کے ساتھ۔ لگتا تھا جیسے اس کے دل کی ساری کیفیت شبینہ کی پسند کے حساب سے رواں ہے۔

''وہ ایسا تو نہ تھا!'' بہنیں دبی زبان سے ابو جی سے کہتیں تو وہ خاموش رہتے۔ انھوں نے کب چاہا تھا کہ وہ سبطین کے پیر سے بڑا جوتا اس کو پہنا دیکھیں، رشتے ناطے پیر میں پہنے جوتے کی طرح آرام دہ نہ ہوں تو زندگی نوری سے ناری بن جاتی ہے۔ سبطین کی زندگی اگر

ناری نہ تھی تو نوری ہونے کے امکانات بھی واضح نہ رہے تھے۔ان کا یہ فلسفہ عمومی ذہن سنتا تو ہنس دیتا۔

''عباسی صاحب اتنی لائق اور بڑے خاندان کی بیٹی آپ کی بہو ہے،غرور تو اس میں ذرا نہیں، جب بھی ملتی ہے ضرور سلام کرتی ہے۔''

ارد گرد کے پڑوسی، احباب، جاننے والے طارق عباسی اور منزہ عباسی کو ان کی خوش قسمتی یاد دلانا نہ بھولتے۔

''ہماری بھابھی ہیں معمولی سی نوکری کرتی ہیں کمپنی میں مگر نخرہ اتنا کہ بس، تمھارے بھائی کی بیوی بھی اپنی اونچی پوسٹ کے باوجود تم لوگوں کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ باپ کے پیسے کی کوئی اتراہٹ بھی نہیں دکھائی، قسمت ہے بھئی!''

سبطین کی بہنیں بھی یہ اور اس سے ملتے جلتے تبصرے سنتیں تو خاموش ہی رہتیں۔ پانی کے اندر اتر کر ہی اس کی کیفیت کو ٹھیک طریقہ سے جانچا جا سکتا ہے۔ کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھنے والوں کی نظر اور ہوتی ہے، اور غوطہ خور کی اور!

اب جبکہ شبینہ جا چکی تھی تو سب کو ہی ایک طرح کی فرحت کا سا احساس ہوا تھا اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد سبطین بھی پروگرام کے مطابق وہاں روانہ ہو گیا جہاں شبینہ تھی اور ایک نئی دنیا جہاں کے سارے انداز اس کی اب تک گزاری زندگی سے یکسر ہی مختلف تھے اور نئے تھے۔ کمالات اور عجائبات بکھرے پڑے تھے۔ شبینہ نت نئی دنیائیں دریافت کرنے کے جنون میں مبتلا ہر کچھ عرصہ بعد کسی نئے کورس کے لیے یونیورسٹی جوائن کر لیتی۔ اس کی پی ایچ ڈی مکمل ہونے کو تھی۔ کینیڈا کے مختلف شہروں میں مختلف اداروں میں لیکچرز کے لیے بھی اس کو بلایا جانے لگا تھا۔ بہت زیادہ نہیں لیکن سال میں دو سے تین بار اسے اکثر سبطین اور دونوں بیٹوں کو چھوڑ کر دوسرے مقامات پر جانا ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنا مستقل قیام ٹورنٹو میں ہی رکھا تھا جہاں ہٹ نما خوبصورت سا گھر شبینہ کے ذوق اور مادی ترقی کو بخوبی ظاہر کرتا تھا۔ ترقی سبطین نے بھی کی تھی مگر پھر بھی شبینہ جتنی نہیں۔ شبینہ اس سے ہمیشہ آگے ہی رہی۔ اب نہ جانے یہ مقدر تھا یا صلاحیت۔ بہر حال شبینہ کی دوڑ میں وہ اس کے ساتھ دوڑنے کا کوئی ارمان نہ رکھ پایا تھا۔

ان کی ملاقات ہفتہ وار ہوتی تھی جسے سبطین خاندان کے لیے قلیل ترین وقت جبکہ شبینہ پروفیشن کی ایمانداری قرار دیتی تھی۔ ایسے میں سبطین کے ہونٹوں پہ خاموش مسکراہٹ آ جاتی، نہ جانے کون سی ایمانداری ہے یہ جہاں میاں بیوی ایک چھت تلے دو اجنبی مسافروں کی

طرح پورے ہفتہ رہتے ہوں۔ نہ جذباتی رشتہ، نہ احساسات کا تعلق اور بات ہے ایمانداری کی، وہ تلخ سوچ سے بچتا ہوا اس میسر وقت کو بھرپور لطف کے ساتھ گزارتا۔

اس کے دنوں بیٹوں کا نام بھی رکھنے میں اس کا کوئی دخل نہ تھا۔ شبینہ نے اولاد کے نام بھی اپنے ان شاگردوں کے نام پر رکھے جن سے وہ انسیت رکھتی تھی۔ ایک وقاص تھا اور دوسرا ذیشان۔ سبطین نے ایک طلحہ اور دوسرا جنید رکھنا چاہا تھا مگر دونوں مرتبہ شبینہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ وقاص طلحہ اور ذیشان جنید کر دے۔ سبطین نے ایسی بات سن کر کوئی اصرار نہ کیا۔ نہ طلحہ پر اور نہ جنید پر۔ اور بھلا اس نے شبینہ سے کب کسی معاملے میں اصرار یا اختلاف کیا تھا۔ اس کو کبھی اپنا آپ اتنا طاقتور لگا ہی نہیں تھا کہ وہ اس سے اونچا اٹھنے کی کوشش کرتا اور اگر کی بھی تو کمال ہنرمندی سے شبینہ اس کے پر کتر دیتی۔ اس نے سبطین کو بس اس حد تک آگے جانے دیا تھا جہاں وہ اس کی طاقت کو چیلنج نہ کر سکے۔ بالا وہی رہے۔ سبطین پاکستان جانا چاہتا تو وہ اس کے لیے ایسے پرکشش مواقع ڈھونڈ نکال لاتی جہاں وہ وقت لگا کر اچھا نام اور دام بنا لے۔ بلاشبہ اس کی ترقی میں ہمیشہ ہی شبینہ کا ہاتھ رہا اور وہ شبینہ کا مشکور ہو جاتا۔

اوٹاوا میں اس نے فلیٹ لے لیا تھا جہاں اکثر شبینہ کو یونیورسٹی جانا ہونے لگا تھا۔ سبطین کو حیرت تھی کہ ٹورنٹو چھوڑ کر یہاں کی یونیورسٹی میں کورس کرنے کی کیا تک ہے! مہینوں کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر اوٹاوا میں ریسرچ ورک بھی وہ ساتھ ساتھ کر رہی تھی۔ یونیورسٹی اسے اس ریسرچ کا معقول معاوضہ بھی ادا کر رہی تھی۔ اب کہ سبطین نے بھی اپنی جاب سے مہینہ بھر کی رخصت لے کر شبینہ کے ساتھ اوٹاوا میں رہنے کا ارادہ کیا تھا۔ دو دن بعد کرسمس کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ رخصت مہینہ بھر کی اس نے لی تھی لیکن بے کار رہی تھی۔ شبینہ کا گھر واپسی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ گو وہ اس شہر میں اپنے لیے کام کے اور مصروفیت کے مواقع ڈھونڈ چکا تھا لیکن چند سالوں سے اسے بیوی کی مصروفیت سخت کھلنے لگی تھی۔ وہ اگر عام سے گھر کا عام سی سوچ کا فرد ہوتا تو دل بہلاوے کو بیوی کا انتظار کرنے کے بجائے کہیں اور سیاحی پر نکل پڑتا۔ لیکن وہ تو سبطین تھا ..... طارق عباسی کا بیٹا! جس کی سرشت میں وفاداری تھی، اور صحیح غلط کا فرق بھی!!

(جاری ہے)

☆☆☆

یہ نصف صدی کا قصہ ہے!

بیگم قاضی حسین احمد (مرحوم) محترمہ ام کلثوم قاضی سے بات چیت

س۔سب سے پہلے تو اپنا اور قاضی صاحب کا خاندانی پس منظر بتایئے۔

ج۔میرا نام ام کلثوم ہے ۔ میں اٹک کے قریب دریائے کابل اور دریائے سندھ کے سنگم پر ایک تاریخی قصبے جہانگیرہ میں پیدا ہوئی۔ میرے والد مولانا لطف اللہ جہانگیروی علمائے دیوبند کے گلِ سرسبد مولانا انور شاہ کاشمیری کے شاگرد خاص تھے۔میرے دادا مولانا عبدالحق جہانگیروی، مولانا محمود الحسنؒ کے ہم عصر تھے اور ان کے کہنے پر اس علاقے میں دینی وعصری علوم کے ایک مرکز کے بانی تھے جو اس زمانے سے ہی مجاہدین کی گزرگاہ رہا ہے۔اس علاقے پر ان دو عظیم الشان تحریکوں کے اثرات ہیں جن کے جوانمردوں نے اپنے عہد کو خیرہ کر دیا تھا۔سید احمد شہیدؒ اور سید اسماعیل شہیدؒ کی تحریک مجاہدین جس کی مہک آج بھی ہماری بستیوں میں جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہیں، محسوس کی جاسکتی ہے۔میں علمائے دیوبند کے کبار علماء کے ایک ایسے گھر میں پروان چڑھی جو مسلم برصغیر کے تابناک ماضی کی کئی منور روایتوں کا امین ہے اور فرنگ کی دشمنی میں اٹھنے والی دیوبند کی حریت مآب تحریک میں شامل جس کے فرزندوں نے عشروں تک بنگال سے کابل تک اجالا کیے رکھا۔تعلیم سے محبت اور دور جدید کے چیلنجز سے صحیح طریقے سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہمارا خاندان مسلک کی حدود میں مقید نہ رہ سکا اور مولانا مودودیؒ کے لٹریچر نے ہمارے ذہنی افق کو مسحور کر دیا۔میرے والد محترم کے چچازاد بھائی مولا عبدالحئی 1955ء سے مولانا محترم کے رسالے ترجمان القرآن کے قاری تھے، اسے پڑھ کر ہمیں بھی سناتے۔میرے دونوں بڑے بھائی مولانا ہدایت اللہؒ اور قاری افضال اللہؒ جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے اولین ارکان میں سے تھے۔میرے والد محترم قاضی صاحب کے ماموں تھے اور قاضی صاحب کی والدہ میری پھپھو تھیں۔ ہمارا گھرانہ دینی و دنیاوی علوم میں ممتاز گھرانہ تھا۔اس کے ساتھ ہی ساتھ قاضی صاحب دس بہن بھائی اور ہم سات بہن بھائی تھے۔ہم سترہ بہن بھائیوں کی ماشااللہ اسی سے زیادہ اولادوں نے ہمیں ایک بھرپور بھرا پرا خاندان دیا۔وہ تصور جسے آج کل سیاسی اسلام گردانا جاتا ہے کہ دین و دنیا،

محراب ومنبر اور عدالت وقیادت کو یکجا کر دیا جائے، میرا میکہ اور سسرال دونوں ہی اس اسلام کے سچے پیروکار تھے جو امام المجاہدین حضور نبی کریمؐ نے دنیا کو سکھایا تھا۔ میرے والد مولانا لطف اللہ ایک مجاہد عالم تھے۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک میں 1953ء میں میرے والد کو گرفتار کر کے جب بیڑیاں پہنائی گئیں تو باوجود اس کے کہ وہ اپنے والدین کے بڑھاپے کے اکلوتے بیٹے تھے مگر لوگ بتایا کرتے ہیں میری دادی نے یہ سن کر کہا کہ میرے بیٹے نے بہت خوبصورت زیور پہنا ہے۔

س۔آپ لوگ رشتہ ازدواج میں کب منسلک ہوئے؟ شادی کی تقریب کس طرح انجام پائی؟ قاضی صاحب نے آپ کو رونمائی میں کیا دیا؟

ج۔ قاضی صاحب پر اپنے ماموں کے گہرے اثرات تھے اور میری شادی بھی اسی وجہ سے 1964ء میں انجام پائی۔ سب لوگ مجھے بہت خوش قسمت سمجھتے تھے کہ مجھے خاندان کے بہت وجیہہ اور قابل سپوت کے لئے چنا گیا۔ قاضی صاحب اپنے دس بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ میں بھی چھوٹی بیٹی ہونے کے ناطے اپنے والدین کی بہت لاڈلی تھی۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب کے ایک بھائی قاضی عطاء الرحمٰن سے میری بڑی بہن نور جہاں اور قاضی صاحب کی ایک بہن مہرالنسا سے میرے بڑے بھائی مولانا ہدایت اللہ کی الحمدللہ کامیاب شادیاں طے پا چکی تھیں اس لئے وہ شادی ابھی تک خاندان کے دلوں میں میٹھی یاد بن کر جگمگاتی ہے۔

میری شادی پر ہمارے گاؤں کے دریا کا پُل میرے سسر سے مٹھائی وصول کرنے کے لئے ملاحوں نے بند کر دیا تھا اور انہوں نے خوشی میں شدید ہوائی فائرنگ کر کے مغرب کے وقت ایک سماں باندھ دیا تھا اور میرے سسر مولانا قاضی محمد عبدالرب خوشی سے نہال ہوئے جا رہے تھے اور اس وقت سب کی جیبوں میں جتنے پیسے تھے وہ انہوں نے خیرات اور مٹھائی کے طور پر سب ان کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس کے بعد قاضی صاحب اپنے بچوں کی شادیوں میں اور تو ہر رسم کے خلاف تھے مگر یہ نیگ وصول کرنے کے لئے وہ خود نوجوانوں کو اکساتے تھے اور سب ان سے خوب کمائی وصول کرتے تھے۔

س۔قاضی صاحب کی کون سی عادت یا خوبی آپ کو سب سے زیادہ اچھی لگی اور ان کو آپ کی کون سی خوبی بہت پسند آئی؟

ج۔ان کی بہت زیادہ ہنس مکھ اور محبت کرنے والی طبیعت نے ہماری زندگی میں کبھی بھی بوجھل پن پیدا نہیں ہونے دیا۔ ہماری زندگی میں کوئی ایسی ناراضگی یا تلخ یاد نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔

س۔سسرال میں آ کر آپ کو کیسا لگا؟ ساس، سسر کا رویہ تو بتایئے۔قاضی صاحب شادی کے وقت کیا کرتے تھے؟

ج۔میری شادی پھپھو کے گھر ہوئی اس لئے ایک ہی خاندان اور ایک ہی مزاج ملا۔سسر بھی قاضی صاحب کی طرح انتہائی محبت کرنے والے، شفیق اور عالم باعمل انسان تھے، مجھ سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔

شادی کے وقت قاضی صاحب سیدو شریف سوات میں جہانزیب کالج میں لیکچرار تھے۔

س۔کبھی قاضی صاحب کے ساتھ جھگڑے کی نوبت آئی ہو کسی بات پر؟ ایسے موقع پر صلح پہلے کون کرتا تھا؟

ج۔چھوٹی موٹی تلخی زندگی کا حصہ ہے اور نوک جھونک ہوتی رہتی تھی مگر قاضی صاحب کی صلح جو طبیعت ماحول کو جلد ہی خوشگوار کر لیتی تھی۔کبھی وہ منا لیتے تھے اور کبھی میں پہل کر لیتی تھی۔

س۔کیا آپ نے پہلے کبھی سوچا تھا کہ قاضی صاحب امیر جماعت بن جائیں گے اور جب یہ ذمہ داری ان پر آن پڑی تو پھر آپ کے تاثرات کیا تھے؟

ج۔جماعت میں تو میرا خیال ہے کہ کسی بھی کارکن کے ذہن میں کبھی بھی یہ خیال آنا ناممکن ہے کہ وہ قیادت کا منصب سنبھال لے گا۔قاضی صاحب مزاجاً کارکن تھے اور وہ قائد بن کر بھی کارکن ہی رہے۔ان کی امارت کا سن کر ان کے لئے استقامت کی دعا کی اور ان کا ہاتھ بٹانے اور صابرانہ رفاقت کا عزم کیا۔

س۔امیر جماعت کی بیگم ہونا کیسا تھا؟ کہیں کوئی مشکل پیش آئی؟

ج۔قاضی صاحب ایک دعا کیا کرتے تھے جو مسنون ہے۔اللھم اجعلنی فی عینی صغیراً وفی اعین الناس کبیراً۔اے اللہ مجھے اپنی نگاہوں میں چھوٹا اور لوگوں کی نظروں میں سرخرو رکھنا۔ہم ہمیشہ یہ دعا کرتے رہے کہ اللہ دنیا اور آخرت کی عزت دینا اور ہمیں لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ کرنا۔حضورؐ کے حضور حاضری کے لئے ہمیشہ یہ مصرعے پڑھا کرتے۔

ور تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

س۔آپ جماعت کی رکن کب بنیں۔اس راہ میں کیا کیا ذمہ داری ملی؟ حلقہ خواتین میں کس رکن جماعت کو آپ نے بے حد مخلص پایا؟

ج۔میری بہت ہی عزیز سہیلی زھرہ وحید، ثریا اسماء، بیگم واصل اور بنت مجتبیٰ مینا کے پر زور اصرار پر میں نے 84ء میں رکنیت کا فارم پر کیا۔اس کے علاوہ بیگم اسعد گیلانی، بیگم مسعود خان، آپا صفیہ قرنی اور آپا بلقیس صوفی میری عزیز سہیلیوں میں سے تھیں۔

س۔آپ کے خیال میں رکن جماعت ہونا اپنی تربیت کے لحاظ سے بہت ضروری ہے یا جماعت میں آئے بغیر بھی خواتین صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکتی ہیں؟

ج۔اجتماعیت اسلام کا اہم ترین تقاضا ہے اور مجھے جماعت کے اندورنی نظام کے کساؤ کی وجہ سے اپنی اور اپنی اولاد کی بہترین تربیت کے مواقع ملے۔ جماعت اسلامی اس مادہ پرست تہذیب کے چنگل سے بچانے کے لئے حفاظت کی ڈھال ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ سارے اچھے لوگ صرف جماعت اسلامی میں ہیں مگر اس دور میں یہ ہماری نئی نسل کے لئے غنیمت ہے۔

س۔قاضی صاحب 22 سال امارت پر فائز رہے۔ آپ کے خیال میں انہوں نے جماعت کو کتنا فائدہ پہنچایا؟

ج۔میرا خیال ہے کہ آپ کو شائد اس سوال کا جواب ان لاکھوں لوگوں سے لینا چاہیے جو قاضی صاحب کی جدائی پر ایسے بے قرار ہیں جیسے وہ ہی سب سے زیادہ ان کے قریب تھے۔ہمیں تو خود ان کی زندگی میں یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ عزیز جہاں ہیں۔ اللہ ان کی کوششوں کو قبول کر کے وہاں بھی عزت وسرفرازی کے مقام پر رکھے۔

س۔قاضی صاحب ایک متحرک شخصیت تھے۔آپ کو ان کے طرزِ سیاست سے کبھی اختلاف ہوا؟

ج۔انکی متحرک طبیعت کی وجہ سے اگرچہ مجھے وہ کبھی کم وقت دے پاتے مگر وہ اتنا بھرپور وقت ہوتا، اتنی محبت اور توجہ ملتی اور انہوں نے مجھے اتنے زیادہ حقوق عطا کیے کہ مجھے ان کی طرزِ سیاست سے اختلاف نہیں بلکہ اتفاق رہا۔میں ان کی ہم سفر بھی رہی اور ان کی کارکن بھی۔ جہاد افغانستان کے زمانے میں ایک دفعہ کیمپوں کے دورے سے واپسی پر مجھ سے پوچھا کہ کبھی ہم پر ایسا وقت آیا تو میرا ساتھ دوگی؟ میں نے جواب دیا کہ آزمائشوں سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے مگر جب آزمائش آئے گی تو دل وجان سے آپ کے ساتھ ہوں گی۔

س۔قاضی صاحب کا دور امارت ایک ہنگامہ خیز دور

تھا۔ ریلیوں، دھرنوں کی یلغار، اسلامک فرنٹ وغیرہ، کیا یہ تمام اقدامات آپ کے خیال میں درست تھے؟

ج۔قاضی صاحب حضور کریم ﷺ کے عاشق امتی تھے انہوں نے جماعت اسلامی میں کبھی بھی کوئی خلاف سنت اور خلاف شرع کام نہیں کیا اور مجھے یقین ہے کہ مولانا مودودیؒ کے اتباع میں انہوں نے اجتماعات عام سے تحریک میں بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کی اور میں نے خود ان اجتماعات سے اپنی زندگی میں اقامت دین کی جدوجہد سیکھی۔

س۔اتحاد عالم کا داعی، ایم ایم اے کا بانی.....مگر خود اپنے دور امارت میں جماعت کے اندر کچھ لوگ ان سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتے رہے اور یہ مطالبہ نہ ماننے پر الگ ہوگئے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ قاضی صاحب نے درست کیا یا انہیں جماعت کے وسیع تر مفاد میں مستعفی ہوجانا چاہیے تھا؟

ج۔قاضی صاحب موجودہ دور میں اتحاد امت کے سب سے بڑے داعی تھے اور انشاءاللہ اتحاد امت کے نقیب ہونے کا لقب ان کے نام کے ساتھ جڑا رہے گا۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کچھ لوگوں کے مطالبے پر وہ مستعفی ہوگئے تھے اور جماعت کے 87% ارکان نے ان پر اعتماد کر کے ان کو تین دفعہ پھر منتخب کیا جبکہ دوسری طرف کے دو چار قائدین واپس جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے اور بقول نعیم صدیقی کے وہ تو ہماری چند خواتین بہنوں کا گروہ ہے، اللہ انہیں خوش رکھے۔ قاضی صاحب اور میرے انکے ساتھ اچھے تعلقات ہیں اور ہم ایک دوسرے کے لئے دعا گو رہتے ہیں۔

س۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ جماعت سے الگ ہوکر تحریک اسلامی بنا بیٹھے ہیں وہ عمل واخلاص اور نیکی وتقویٰ میں بہت آگے تھے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں؟

ج۔تقویٰ دل کے اندر کی کیفیت کا نام ہے جو اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں آسکتا۔ اللہ سب کے پردے ڈھکے ہی رکھے۔

س۔اب تک تین امرائے جماعت اپنی ذمہ داریاں نبھا کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے ہیں۔ آپ کے خیال میں کس امیر جماعت کا دور سب سے بہترین رہا اور کس وجہ سے؟

ج۔سب امرائے جماعت نے اپنی اپنی جدوجہد کی اور اللہ کے حضور حاضر ہوگئے ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہوجائے اور انکی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے۔

س۔امیر جماعت کی بیگم قاضی اور بغیر امارت کے

بیگم قاضی میں کہاں کہاں اور کیسا کیسا فرق محسوس کیا آپ نے؟

ج۔الحمدللہ جماعت اسلامی کے کارکنان نے ہمیشہ اپنی محبت اور عزت سے نوازا قاضی صاحب کے جانے کے بعد تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے کتنے پیارے لوگوں کے درمیان چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں۔میرا اتنا بڑا غم تقسیم ہوکر کم ہوجاتا ہے۔

س۔ماشااللہ پچاس برس کا ساتھ رہا آپ دونوں کا۔ذرا یہ تو بتایئے کہ قاضی صاحب کن باتوں پر زیادہ خوش ہوتے تھے اور رنجیدہ کن باتوں پر؟ آپ کو تحائف کب کب اور کیا کیا دیا کرتے تھے؟ کھانے پینے میں کیا مرغوب تھا؟ جلال میں کب آتے تھے؟

ج۔یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ایک انٹرویو اور ایک سوال میں اس کا جواب دینا ناممکن ہے الحمدللہ بہت خوبصورت یادیں ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی میں مجھے ایک مفہوم سے اچھی طرح آشنا کرایا اور وہ ہے ''محبت کے ساتھ عزت واحترام''

اتنی زیادہ قدردانی اور اتنی محبت اور سب سے بڑھ کر عزت افزائی کرنا جس نے ہمارے خاندان کی مضبوط بنیاد رکھی۔ بہت زیادہ تحفے تحائف دینے کا شوق رہا۔ میرے بچے بتاتے ہیں کہ سب سے خوبصورت چیز اور سب سے مہنگی چیز دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ امی کے لئے ضرور لے لو۔راحیل کہتی ہے کہ مجھے کتنی دفعہ پیسے دیئے کہ امی کے لئے ڈائمنڈ کی انگوٹھی لے لو۔مگر چونکہ مجھے زیورات سے کوئی شغف نہیں تھا اس لئے رقم لاکر مجھے دے دیتی تھی کہ آغا جان نے دیئے تھے انگوٹھی لینے کے لئے مگر آپ کے ڈر سے نہیں خریدی مگر ابھی راحیل کے بیٹے محمد کی شادی پر اسکی دلہن کو اور مجھے دونوں کو تحفے میں انگوٹھیاں دیں۔

بہت سادہ کھانا کھاتے تھے مگر بہت شوق سے کھاتے تھے۔ان کی زندگی میں جلال کے لمحات بہت کم آتے تھے۔کوئی جھوٹ بولتا تو اس پر بہت ناراض ہوتے تھے۔خیانت پر بہت غصہ کرتے تھے۔

س۔نفلی عبادات کا کیا عالم تھا؟ گھر کے اندر ان کے معمولات کیا تھے؟

ج۔قرآن وحدیث انکی زندگی کا لازم حصہ تھا اور نفلی عبادات میں بہت اخفا کا خیال رکھتے تھے اس لئے میں بھی اس پر بہت تبصرہ نہیں کروں گی مگر وہ آج کے دور کے ولی تھے، جیسا ظاہر ویسا باطن، سفید لباس کی طرح کردار بھی اجلا، اللہ ان سے راضی ہوجائے۔سب سے بڑی

عبادت انہیں اقامت دین کی جدوجہد نظر آتی تھی اور وہ قرآن کریم سے اس کے لئے ہدایات کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے تھے۔

س۔بچوں میں سے کس سے سب سے زیادہ محبت تھی انہیں؟اور آپ کو کس سے ہے؟

ج۔بچوں میں اتنا زیادہ توازن رکھتے تھے کہ ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ وہ مجھ سے سب سے زیادہ قریب تھے۔بس جس بچے کو زیادہ ضرورت ہوتی تھی اسی کے زیادہ قریب ہوکر اس کا خیال رکھتے تھے۔میں بھی پوری زندگی میں یہ توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔الحمدللہ چاروں بچے ان کے دست وبازو بنے رہے۔وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کی اولاد ان کی نظریاتی کارکن بھی ہے۔

س۔قاضی صاحب کے ہوتے ہوئے آپ کی مصروفیات کیا تھیں اور اب معمولات کیا ہیں؟

ج۔ان کی زندگی بھی بھرپور اور اب ان کی جدائی بھی اتنی مصروفیت کا باعث ہے کہ مہینہ سے زیادہ ہوگیا ہے اور ایک تانتا بندھا رہتا ہے۔

س۔پچاس برس اکٹھا رہنے کے بعد آپ ان کی جدائی کو کیسا محسوس کرتی ہیں؟

ج۔ان کی مغفرت کی دعائیں کرتی ہوں اور ان سے جنت میں ملنے کا انتظار ہے۔اللہ ان سے راضی ہوجائے۔

س۔آپ نے یا کسی اور فرد نے انہیں خواب میں دیکھا ہو؟

ج۔وہ خوابوں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتے تھے ہمیں کچھ لوگوں نے ان کے بارے میں اچھے خواب بتائے ہیں مگر میں ان کے لئے اپنے رحمٰن رب سے دعا گو ہوں کہ وہ انہیں خوش رکھے اور اپنی رحمتوں میں رکھے۔

س۔آئندہ آپ کیا مصروفیات رکھیں گی؟لاہور میں ہی رہیں گی یا پشاور میں؟

ج۔میں انشااللہ اگر زندگی رہے تو منصورہ میں رہوں گی۔

س۔اپنے خاندان پر وہ ایک شجر سایہ دار کی مانند تھے۔چند واقعات بتائیں گی؟

ج۔اپنے خاندان اور آس پڑوس کے سب لوگوں سے ان کا تعلق تو آپ آکر اب دیکھیں کہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔کیا رشتے دار،کیا یتیم،کیا ملازم،کیا ہمسائے اور کس کس کی بات اور کس کس کا قصہ سناؤں۔بس راحیل کی ایک یہ بات کہ میرے شوہر کی

وفات کے بعد وہ جس طرح میرا اور میرے بچوں کا سائبان بنے،اپنے آغا جان کی مغفرت کے لئے بس میں ہی کافی ہوں انشا اللہ۔آپ سب سے درخواست ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت کیا کریں اور مجھے بھی اور میرے بچوں کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ اللہ دنیا میں اپنی دین کی مزدوری کا کام لے لے اور آخرت میں ہم سے راضی ہو جائے۔آمین۔

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریہؒ

ان کا شمار دوسری صدی ہجری کی شہرہ آفاق عارفات میں ہوتا ہے قبیلہ قیس بن عدی کی ایک شاخ العتیق کی کنیز تھیں۔اسی نسبت سے انہیں عدویہ اور القیسیہ کہا جاتا تھا۔ اپنی ظاہری خوبیوں کی بناء پر ام الخیر کے لقب سے یا کنیت سے بھی شہرت پائی۔ان کا ایک لقب ''تاج الرجال'' ہے

۹۵ ھجری یا (۹۹ ھ) میں بصرہ (عراق) کے ایک نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام اسمٰعیل تھا۔ وہ اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھیں اس لئے رابعہ کہلائیں۔ ابھی آپ چار پانچ سال کی تھیں کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جب آپ آٹھ سال کی ہوئیں تو بصرہ میں خوفناک قحط آ گیا بقول شیخ سعدیؒ

؎یکے قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

(ایک بار دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق وعاشقی جیسی چیز کو بھی بھول گئے)

ان ہولناک حالات میں رابعہ بصریہ اور ان کی تین بہنوں نے چند دن تو فاقے برداشت کر لئے لیکن جب بھوک حد سے بڑھنے لگی تو بھیک مانگنے تک نوبت آ گئی۔مگر کوئی کیسے بھیک دیتا کہ دینے والے کے پاس خود کچھ نہ تھا۔ انہی دنوں بصرہ کا مشہور تاجر عتیق ادھر سے گزرا اس نے چاروں بہنوں کے زرد چہروں اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر پوچھا ''آپ کیا چاہتی ہیں؟'' ایک بہن نے کہا ہمیں کچھ کھانے کو مل جائے گا؟ عتیق کی نگاہ سب سے چھوٹی بہن پر پڑی جو خاموشی سے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت سے متاثر ہو کر عتیق نے پوچھا اے لڑکی! تجھے بھوک نہیں ہے؟ نقاہت بھری آواز میں جواب ملا۔ بہت بھوک ہے۔عتیق نے کہا کہ تو پھر کسی سے روٹی کیوں نہیں مانگتی۔رابعہ نے عجیب جواب دیا، جس سے مانگنا چاہیے اسی سے مانگ رہی ہوں۔

عتیق نے دوسرا سوال کیا تو پھر تجھے ابھی تک روٹی کیوں نہ ملی؟ رابعہ نے جواب دیا جب وقت آئے گا وہ بھی مل جائے گی۔

عتیق لڑکی کے دانشمندانہ جواب سے متاثر ہوا اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اگر یہ آٹھ سال کی چھوٹی لڑکی گھر کے کام کاج کے لئے باندی کے طور پر مل جائے تو سودا اچھا ہے۔ اس نے بڑی بہنوں سے کہا میں تمہیں اتنے پیسے دیتا ہوں کہ قحط کے حالات میں تمہیں کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ چھوٹی بہن کو میرے ساتھ بھیج دو یہ میری خدمت کیا کرے گی۔ بہنیں فوراً مان گئیں کیوں کہ رابعہؒ کے جانے سے ان کے تمام مسائل حل ہو رہے تھے۔ عتیق نے دینا رسے بھری تھیلی بڑی بہنوں کے حوالے کی اور رابعہؒ کو ساتھ لے کر اپنے گھر آ گیا یوں یہ معصوم بچی اپنی بہنوں سے بچھڑ کر ایک صاحب ثروت انسان کی کنیز بن گئی۔

رابعہؒ نوعمر ہونے کے باوجود انتہائی مشقت اور ذمہ داری کے ساتھ اپنا کام پورا کرتیں اور مالک کو کسی قسم کی شکایت کا کوئی موقع نہ دیتیں۔ جب انکی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوئی تو دل میں ذوق عبادت خوب بڑھ گیا۔ گھر کے کام کاج کرنے کے بعد وہ پوری رات عبادت میں مصروف رہتیں۔ ایک مرتبہ نصف شب کے قریب عتیق کی آنکھ کھلی وہ کسی ضرورت کیلئے کمرے سے باہر نکلا تو اس کی نگاہ کنیز کی کوٹھری پر پڑی جہاں چراغ جل رہا تھا۔ عتیق حیران ہو کر سوچنے لگا رابعہ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟ پھر وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کوٹھری کے دروازے تک پہنچا تو اس نے رابعہ کو مصلیٰ پر سجدہ ریز دیکھا۔ سجدے کی حالت میں رابعہ نہایت رقت آمیز لہجے میں دعا مانگ رہی تھیں۔

''اے اللہ! تو میری مجبوریوں سے واقف ہے، گھر کے کام کاج کی مشغولیت مجھے تیری طرف آنے سے روکتی ہے تیرا منادی مجھے تیری عبادت کیلئے پکارتا ہے مگر میں جب تیری بارگاہ میں حاضر ہوتی ہوں تو نمازوں کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اے اللہ! میری معذرت قبول فرمالے اور میرے گناہوں کو معاف کردے۔''

مالک نے جب رابعہؒ کی گریہ وزاری سنی تو خوفِ خدا سے کانپنے لگا۔ الٹے قدموں واپس چلا گیا اور رات کا باقی حصہ جاگ کر گزار دیا پھر صبح ہوتے ہی رابعہؒ کی کوٹھری میں پہنچا اور کہنے لگا ''رابعہ آج سے تم آزاد ہو جہاں چاہو چلی جاؤ۔''

رابعہؒ یہ سن کر حیران رہ گئیں، ان کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے ''میں آپ کی دی ہوئی قیمت ادا نہیں

کرسکتی۔'' مالک نے کہا ''میری طرف سے کی جانے والی تمام زیادتیوں کو اس ذات کے صدقے میں معاف کردو جس کی عبادت تم راتوں کو تنہائی میں چھپ چھپ کر کرتی ہو۔

رابعہ نے جواب میں کہا ''میں نے آپ کو معاف کیا اللہ بھی آپ کو معاف فرمائے۔'' یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئیں۔

بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ حضرت رابعہؒ نے تمام زندگی تجرد میں گزاری بعض کہتے ہیں انہوں نے شادی کر لی تھی اور اولاد بھی تھی مگر ادھیڑ عمر میں بیوہ ہوگئیں۔اس کے بعد دوسرا نکاح نہیں کیا۔

غلامی سے آزاد ہونے کے بعد وہ صحرا میں عزلت گزیں ہوگئیں۔معلوم نہیں عزلت گزینی کا زمانہ کتنے سالوں پر محیط ہے لیکن یہی وہ دور ہے جس میں انہوں نے سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کیں اس کے بعد بصرہ آ گئیں اور باقی ساری زندگی وہیں گزاری۔ بصرہ میں قیام کے بعد ہی ان کے زہد وتقویٰ اور علم ومعرفت کی شہرت دوردور تک پھیل گئی۔ لوگ جوق درجوق کسبِ فیض کیلئے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں اس دور کے بڑے بڑے مشائخ طریقت، زہاداور صلحاء بھی شامل تھے۔ تذکرہ نگاروں نے اس سلسلے میں امام سفیان ثوریؒ، حضرت مالک بن دینارؒ، حضرت شفیق البلخیؒ اور حضرت رباح القیسیؒ کے اسمائے گرامی صراحت کے ساتھ لئے ہیں۔

عبادت میں خلوص

حضرت رابعہ بصریؒ کے ارشادات جو مختلف تذکروں میں نقل ہوئے ہیں ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار تھیں اور اس کی رضا کے سوا کسی چیز کی طلب گار نہ تھیں انکی اللہ سے محبت بالکل بے غرض تھی۔ یہ خالص محبت صرف اس کی ذات کی خاطر تھی۔ لوگوں کو بھی وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی محبت کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ان کی ایک مشہور دعا سے ان کے خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''اے میرے مالک اگر میں دوزخ کے ڈر سے تیری عبادت کرتی ہوں تو تو مجھے دوزخ میں پھینک دے اگر میں جنت کی خاطر تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے جنت سے محروم کردے لیکن اگر میں صرف تیری ہی خاطر تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھ کو اپنے دیدار سے محروم نہ کرنا۔''

ایک دفعہ کسی نے کہا ''جو لوگ آپ سے اخلاص

وعقیدت رکھتے ہیں آپ ان سے مدد کیوں نہیں مانگتیں۔''

انہوں نے فرمایا''میں تو دنیا کی چیزیں اس سے بھی مانگتے ہوئے شرماتی ہوں جو ہر شے کا خالق ہے پھران سے کیسے مانگوں جو کسی چیز کے حقیقی مالک نہیں۔''

شکر کی پٹی

ایک دفعہ آپ نے ایک جوان کوسر پر پٹی باندھے ہوئے دیکھا ۔ اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا میرے سر میں درد ہے۔انہوں نے پوچھا تیری عمر کتنی ہے اس نے کہا تیس سال۔ پوچھا کیا ان تیس سالوں میں پہلے بھی کبھی بیمار ہوا؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا،افسوس کہ تیس سال تم نے تندرستی کے شکر کی پٹی تو نہ باندھی لیکن صرف ایک دن کی بیماری میں شکایت کی پٹی باندھ لی۔ وہ نوجوان سن کر شرمندہ ہوا اور اس نے اپنے اندر صبر پیدا کرنے کی نیت کرلی۔

نبوت اور عورت

ایک مرتبہ کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے''اللہ تعالیٰ نے مرد کو فضلیت بخشی ہے۔مردوں کو ایسے مرتبے حاصل ہوئے جو عورتوں کو کبھی نہیں مل سکے۔کیا اس کا یہ سبب نہیں کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔اسی لئے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرتبہ نبوت پر ہمیشہ مردوں ہی کو فائز کیا اور اس اعزاز سے عورتوں کو ہمیشہ محروم رکھا۔''

حضرت رابعہؒ نے جواب دیا''بھائیو! کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی عورت نے آج تک خدائی کا دعویٰ کیا ہو؟ یہ استکبار بھی مردوں کے حصے میں آیا ہے،بات تو یہ درست ہے کہ اللہ نے کبھی کسی عورت کو مرتبہ نبوت پر فائز نہیں کیا مگر یہ بھی تو سوچو کہ جتنے نبی، صدیق،شہید اور ولی ہوئے ہیں وہ عورتوں ہی کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں انہی کی گود میں تربیت پائی اور پروان چڑھے۔کیا عورتوں کا یہ رتبہ کچھ کم ہے؟'' یہ سن کر سب لاجواب ہوگئے۔

دوسرا دوست

ایک مرتبہ آپ اپنے عبادت خانے میں سوئی ہوئی تھیں کہ ایک چور اندر داخل ہوگیا۔اس نے دیکھا فقط ایک چادر کے سوا کچھ بھی موجود نہیں۔اس نے چادر اٹھائی اور جانے لگا۔اچانک اس کی بینائی زائل ہوگئی اور اسے دروازہ نظر آنا بند ہوگیا وہ گھبرا گیا۔ چادر اس

کے ہاتھ سے نیچے گر گئی اسے دروازہ دوبارہ نظر آنے لگا۔ اس نے سوچا یہاں سے نکل جاؤں کہیں بینائی ہمیشہ کیلئے زائل نہ ہو جائے۔ جب دروازے سے نکلا تو ایک آواز آئی ''اگر ایک دوست سویا ہے تو دوسرا دوست جاگتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی ہیبت کا اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے ہمیشہ کیلئے چوری سے توبہ کر لی۔

اللہ کے وعدے پر یقین

ایک مرتبہ رابعہ بصریؒ کے ہاں پانچ درویش حاضر ہوئے کھانے کا وقت قریب تھا چنانچہ رابعہ بصریؒ نے خادمہ کو بلا کر پوچھا مہمانوں کو پیش کرنے کے لئے گھر میں کچھ موجود ہے؟ اس نے کہا صرف ایک روٹی موجود ہے۔ آپ نے فرمایا ایک روٹی پانچ مہمانوں کے لئے ناکافی ہے۔ اتنے میں ایک سوالی نے دروازے پر صدا لگائی۔ رابعہ بصریؒ نے خادمہ سے کہا وہ روٹی ضرورت مند کو دے دو۔ خادمہ نے حکم کی تعمیل کی۔ کچھ دیر کے بعد خادمہ نے بتایا کہ ایک شخص کھانا لے کر آیا ہے۔ رابعہ بصریؒ نے پوچھا کتنی روٹیاں ہیں۔ اس نے کہا دو روٹیاں ہیں۔ انہوں نے کہا اسے واپس بھیج دو یہ کھانا ہمارا نہیں ہے۔ خادمہ نے روٹیاں واپس بھیج دیں۔ تھوڑی دیر بعد خادمہ نے اطلاع دی ایک اور شخص کھانا لے کر آیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کتنی روٹیاں ہیں اس نے کہا پانچ روٹیاں ہیں۔ انہوں نے پھر وہی جواب دیا واپس بھیج دو یہ کھانا ہمارا نہیں۔ خادمہ نے ایسا ہی کیا کچھ اثنا کے بعد خادمہ نے اطلاع دی ایک شخص کھانا لایا ہے اور اس میں گیارہ روٹیاں ہیں۔ رابعہ بصریؒ نے کہا ہاں قبول کر لو۔ یہ ہمارا رزق ہے، اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ مہمان حضرات یہ سب کچھ دیکھ کر مجسمہ حیرت بن گئے۔

اتنے میں خادمہ نے دسترخوان پر کھانا چن دیا جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو مہمانوں نے سوال پوچھا کہ آپؒ نے دو مرتبہ کھانا واپس بھیج دیا تیسری مرتبہ قبول کیا اس میں کیا راز ہے؟ رابعہ بصریؒ نے فرمایا ''اللہ رب العزت کا وعدہ ہے کہ دنیا میں ایک کے بدلے دس اور آخرت میں ستر دوں گا۔ میں نے ایک روٹی خلوص نیت کے ساتھ سائل کو دی تھی مجھے پکا یقین تھا کہ ایک کے بدلے میں دس ملیں گی۔ جب تیسرا شخص گیارہ روٹیاں لایا تو ایک کے بدلے میں دس اور گیارہویں جو سائل کو دی تھی وہ بھی اللہ نے واپس کر دی۔ اللہ کی شانِ رزاقی دیکھئے کہ اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا۔'' رابعہ بصریؒ کی شانِ توکل دیکھ کر تمام

درویش حیران رہ گئے۔

حضرت رابعہ بصریؒ کی موت کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ وفات سے کچھ دیر پہلے لوگ عیادت کیلئے حاضر ہوئے۔ رابعہ بصریؒ نے کہا ''فرشتوں کے لئے راستہ چھوڑ دو۔'' لوگ باہر چلے گئے کچھ دیر اندر گفتگو کی آوازیں آتی رہیں جب خاموشی چھا گئی لوگوں نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ رابعہ بصری دنیا سے اس طرح جا چکی تھیں جس طرح بادنسیم کا کوئی جھونکا تیزی سے گزر جاتا ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے ۲۸۵ ہجری میں بصرہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں۔

(استفادہ: تاریخ اسلام کی چار سو باکمال خواتین از طالب ہاشمی۔ خواتین کے کارنامے از مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی)

☆☆☆

سرزمین منیٰ الوداع!

طوافِ زیارہ سے واپسی پر سفر بہت ناخوشگوار گزرا۔ اشتیاق کو یہ بات ہضم نہیں ہورہی تھی کہ حج کے دنوں میں من چاہے دام کیوں، حاجیوں کو لوٹنے کا یہ سلسلہ صحیح نہیں اور حکومت کو اس کی خبر ہونی چاہیے بہرحال کیمپ پہنچے تو ہماری قربانی ہونے کی اطلاع بھی موصول ہوچکی تھی۔ کسی نے ٹوکن جمع کروائے، کسی نے معلم کو قربانی کے ریال تھمائے کسی نے جان پہچان والے کی خدمات حاصل کرلیں۔ جس سے بھی پوچھا قربانی کی قیمت ساڑھے تین سو ریال سے ساڑھے چار سو ریال کے لگ بھگ تھی۔ اپنی طرف سے پوری تسلی کرکرا کے ہی انہوں نے ریال جمع کروائے آگے کا معاملہ اس پر چھوڑ دیا جس کو قربانی کا خون اور گوشت نہیں تقویٰ پہنچتا ہے۔

ہوسکتا ہے حجاج کرام خود بھی اپنے ہاتھوں سے جانور ذبح کرکے سنت ابراہیمی پر عمل پیرا ہوتے ہوں لیکن مشکل لگتا ہے۔ اشتیاق تو آخری وقت تک اصرار کرتے رہے کہ جس کو قربانی کے پیسے جمع کرواتے ہیں وہ آفر دے رہا تھا کہ چاہو تو قربانی کا کچا گوشت لے جاسکتے ہو۔ اتنی مرغن آفر پر کسی کی رال نہ ٹپکے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ انہیں بہت سمجھایا کہ گوجرہ کی عبدالحق کالونی نہیں جہاں دس گیارہ بکرے قربانی کرنا ہوں اور باری کے انتظار میں کھڑے ہوں۔ یہ تو منیٰ ہے۔ لاکھوں قربانیوں کا مرکز، جہاں لاکھوں جانور بس ایک شخص کی محبت کو تازہ کرنے کے لئے ہر سال ذبح کیے جاتے ہیں۔ اور کوئی مکھی، کوا، مچھر نظر نہیں آتا۔ دوسرا یہ کہ قربانی کا ایک کلو گوشت لے کر پریشر ککر، لہسن پیاز، نمک مرچ سو جھنجھٹ کی بجائے شکر کریں۔ اللہ بھلا کرے راشدہ کا جو قربانی کے گوشت کا پلاؤ اور شامی کباب رائتے سلاد کے ساتھ لے آئی اور اشتیاق کو ''وڈی عید'' کا سا سماں مل گیا۔

ایک باپ کی لازوال محبت الٰہی پر اللہ ہر سال کروڑوں جانور قربان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ سب اس ایک قربانی کا فدیہ ہیں جو اسماعیلؑ کی قربانی کے جواب میں دیا جاتا ہے۔ اللہ جانے وہ جگہ کون سی ہوگی! میں نے منیٰ کو چاروں اور دیکھ کر سوچا۔

جہاں اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی سکھائے گئے۔

جہاں عقل دم بخود رہ گئی ہوگی
جہاں عشق گونگا ہوگیا ہوگا

جنوں ، جذبہ، محبت...... سب لفظ شرمندہ ہو گئے ہوں گے۔

فرشتوں کو "یہ فساد کرے گا" کا جواب اس انداز میں دے کر اللہ رب العزت کو ابراہیمؑ پر کتنا پیار آیا ہوگا۔ میرے بس میں نہیں تھا حضرت ابراہیمؑ پاس ہوں اور میں ان سے اظہار عقیدت کروں۔ بس درود ابراہیمیؑ پڑھ کر چپ ہوگئی۔

تینوں دن اللہ نے توفیق دی کہ تینوں جمروں پر پہلی صف میں کنکریاں ماریں۔

ارے ہاں یاد آیا۔ ایک کنکری مارنے پر ایک گناہ کبیرہ معاف ہوتا ہے۔ یہ سوچ آتے ہی بجائے خوشی کے میں لرز کر رہ گئی۔ پہاڑوں جتنے کبیرہ گناہوں میں سے چند ایک بخشے بھی گئے تو کیا؟؟

"جی نہیں" میاں نے تسلی دی، کل کے سات گناہ معاف کرانا باقی ہیں، ہم تیرہ ذی الحج کو بھی کنکریاں ماریں گے۔ نبی اکرمؐ کے حجتہ الوداع کے متعلق اور سب محدثین کا اتفاق ہے کہ آپؐ نے تیرہ ذی الحج کو کنکریاں ماری تھیں۔ اس کے بعد منیٰ سے روانہ ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم بھی اسی مسنون حج کے شوق میں منیٰ میں رک گئے۔

بارہ ذی الحج کو معلم کے اس اعلان پر کہ جو آج جانا چاہتا ہے وہ چلا جائے بس تیار ہے۔ جیسے پنجرے سے قیدی نکلتے ہیں سب چھوٹ نکلے، ہزاروں کے خیمے میں، اکیلی میں......میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دبی دبی زبان میں ان سے کہا سب جا رہے ہیں۔ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔

"کوئی بات نہیں ، میں ہوں ناں، دوسرے خیمے میں۔" انہوں نے تسلی دی۔ جانے والوں کو میں نے ہنسی مذاق میں بہت روکنا چاہا مگر بقول اسلم انصاری

؎ جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی!

سو کوئی نہ رکا، بھیڑ چال میں سب کا سامان بندھ گیا۔ عرفات سے آیا سامان اور منیٰ سے ملنے والے ہدیے بھی ہمراہ تھے۔ میں دل ہی دل میں سخت گھبرا رہی تھی۔ دعا گو تھی اللہ کوئی اور دیوانی میری طرح جو کل تک رک جائے، ہائے کیا کروں، میری گھبراہٹ دیکھ کر اشتیاق نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"تو تم بھی چلی جاؤ گروپ کے ساتھ"

"میں نے وہاں جا کر سالن بنانا ہے یا واشنگ مشین سے کپڑوں کی دھلائی کرنا ہے؟" میں نے جواب

دیا۔ایک دم دل میں شازیہ کا خیال آیا ایک لمحے میں اس سے رابطہ کیا اور میرا سیل فون جس کے متعلق شازیہ کو ہمیشہ شکوہ رہتا ہے کہ آواز نہیں سنائی دیتی اس دن آواز بھی ''صاف،شفاف''تھی۔

''السلام علیکم شازیہ کہاں ہو؟'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''باجی ہم جمرات سے واپس جارہے ہیں۔ خیمے والے سب چلے گئے۔''اس نے کہا۔

''تو تم میرے خیمے میں ہی آجاؤ۔ میں اکیلی ہوں۔''

لیں جی چند منٹوں میں اللہ نے کیا سبب بنایا۔ وہ سرزمین جو رب کی نشانی ہے جسے اس نے چن لیا، جہاں کوڑے کے ڈھیر پر مکھی نہیں آتی۔ مچھر نہیں تنگ کرتا۔ حشرات الارض نہیں ہوتے۔ جہاں کروڑوں قربانیوں کے گوشت اور خون پر ایک کوا یا چیل نہیں منڈلاتی، جہاں کی سرزمین کو اللہ نے یہ خاصیت دی ہے کہ جتنا بڑا مجمع ہے یہ سب کو سمیٹ لیتی ہے۔ اللہ نے ہمیں وہاں ایک رات اور قیام کا موقع دے دیا بلکہ ایک خواہش اور پوری کردی جو پاکستان میں ایک ہی ضلع میں رہتے ہوئے ممکن نہ تھی۔ دو سہیلیوں کی ایک جگہ اکٹھے رہنے کی خواہش! گو کہ حرم میں باب فہد کے پنکھے ہمارے بہت کام آتے۔ پھر بھی رات تو رات ہے ناں۔ چالیس پینتالیس منٹ میں شازیہ اور جاوید بھائی کو میاں صاحب لے آئے۔الحمدللہ بہت اچھی رات گزری۔

صبح حج کا آخری دن تھا۔ اللہ کی شان وشوکت کا مظاہرہ جتنا حج میں ہوتا ہے اتنا کسی اور فرض عبادت میں نہیں۔ گناہوں کے میل کچیل کو دھونے کا رکن.....فسق جدال اور شہوانیت سے بچ کر کیے حج کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں۔آخری دن حج کا سارا فلسفہ سمجھ میں آرہا تھا۔وہ ابراہیمؑ جو سب انبیاؑ کے لئے رول ماڈل تھے، پورے جہاں میں شرک کی گندگی دور کرنے والے.....اللہ رب العزت کی ہر آزمائش پر پورے اترنے والے.....ابراہیمؑ خلیل اللہ کی یاد میں سالانہ اجتماع جو ہر سال اللہ کی طرف سے منعقد ہوتا ہے۔ دیوانے پروانے لبیک اللھم لبیک کی صدا لے کر چاروں اور پھیلتے ہیں۔اس ترانے کی نغمگی دلوں کے تار ہلا دیتی ہے۔آج اسی حج کا آخری دن ہے۔میں اور شازیہ بار بار اپنے حج کی یاداشتوں کو تازہ کررہی تھیں یہاں تک کہ مسجد خیف میں ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔عورتوں کے ہجوم بلکہ اژدھام میں اللہ نے ہماری کیسے جگہ بنائی یہ اک اور داستان ہے۔لیکن وہ مسجد جہاں ہر نماز کی امامت ہوتی

ہے جہاں انبیا کرام نے نماز ادا کی کتنی اہم جگہ ہے۔ خداجانے جہاں میں بیٹھی ہوں اس سرزمین نے کس نبی کے قدم مبارک چومے ہوں گے!!

ظہر کی نماز کے بعد ہمارا قافلہ جانب جمرات تھا۔ کنکریاں مارنے کا آخری دن۔ منیٰ سے رخصتی کا دن!!

میرا دماغ ابھی بھی اس سرزمین کا بھید تلاش کررہا تھا جس کے قرب میں عرفات ہے، یہ ٹھیک ساری سرزمین عرب میدان حشر ہوگی لیکن ان کی فضلیت کیا ہے؟ بالآخر اپنے تئیں ہم نے حساب لگایا چونکہ اللہ یہاں بندے کو بار بار جمع کرتا ہے، ہو نہ ہو (ہو بھی سکتا ہے) یہی وہ جگہ ہے جہاں عرش اتارا جائے گا اسی لئے یہاں کی فضا اتنی پاک اور مقدس ہے۔

یہ سوچتے ہی میرا دل مٹھی میں آ گیا۔

میرے پاؤں جیسے منیٰ کی زمین سے چپک گئے۔ دل ودماغ کے تار ہل گئے۔ ظاہر ہے عرفات میدان حشر ہے تو عرش اتارنے کے لئے اس سے مقدس جگہ کون سی ہوسکتی ہے جہاں انسانیت رب کے امتحان پر پوری اتری؟؟

جہاں بیٹے نے جگر گوشہ قربانی کے لئے پیش کردیا!! جہاں کی سرزمین پر جبرائیل امین کو بھیجا اور کہا پلک جھپکنے سے پہلے اسماعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا ذبح ہونا چاہیے۔

رب کے وعدے کو سچ کرنے والی سرزمین!!

میری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عرفات کے قریب ہی وہ جگہ ہو جہاں میرے آقاؐ شفاعت کے لئے سجدے میں جائیں گے۔ اس سجدے والی سرزمین پر جہاں امت کے لئے شفاعت کی درخواست کی جائے گی۔ جہاں حمد وثناء کے وہ الفاظ القاء کیے جائیں گے جو رب کی عنایت ہوں گے۔ آج جہاں رحمت برستی ہے اور جہاں سے ہر کوئی خوش جاتا ہے۔ اے سرزمین منیٰ الوداع!

میں نے بچشم نم تیرہ ذی الحج کو سوا ایک بجے کے لگ بھگ الوداعی نظر منیٰ کی سرزمین پر ڈالی۔

تو خدا کا بھید ہے۔ تیرے بھید کو کوئی نہ جان سکا۔

لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ تو میرے آقاؐ کی منتخب جگہ ہے، وی آئی پی اسٹیشن ہے!!

مجھے تو لگتا ہے تیرہ ذی الحج کو بھی تمام دنیا کے حاجی موجود تھے بس جو گئے وہ پاکستانی تھے۔ منیٰ کی سڑکیں بھی آباد تھیں اور خیمے بھی۔ اب چونکہ شازیہ کے اور میرے دونوں کے نصف بہتر (جو اکٹھے ہوکر بہت بہتر ہوگئے اور

ہم بیچاریوں کو پیچھے بھول جاتے)اکٹھے تھے اس لئے مکہ کی جانب پیدل سفر شروع ہوا۔ پاکستان سے جاتے ہوئے ٹائیفائڈ کا پھر اثر ہونے لگا۔ کئی دنوں کی بے آرامی اور مسلسل سفر نے جسم وجان کو بخار کی بھٹی میں تپا رکھا تھا۔ پیناڈول لے کر چل تو پڑے لیکن راستے میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور ہر دو حضرات بس ابھی حرم آ جائے گا کہہ کر چپ کرا دیتے۔ میرے واویلے پر چند لمحوں کے لئے چار کا یہ گروپ سڑک کے کنارے سانس لینے کو رکا اور پھر چل پڑا۔ پانچ سات منٹ چلنے پر میری حالت بہت خراب ہوگئی۔

''مجھے ٹیکسی کروادیں۔'' میں نے شازیہ سے درخواست کی۔

آگے لمبی بلکہ بہت لمبی غالباً دوکلومیٹر کی سرنگ آرہی تھی ٹیکسی کہاں سے ملے گی! میرے پاؤں سوج گئے تھے جب ایک کوچ کا ڈرائیور ''حرم،حرم'' کی خوشخبری کے ساتھ آیا، دروازے کھولے اور ہم سب اندھا دھند اندر جا بیٹھے۔

اشتیاق نے اشارے سے پوچھا ٹکٹ۔

نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہدیہ کہہ کر اس نے کوچ منٹوں سیکنڈوں میں باب فتح کے سامنے روکی۔ لیکن یہ منٹ سیکنڈ ہم پر صدیوں جتنے بھاری ہوگئے۔ جب سکون کا لمبا سانس لے کر کمر سیٹ کی پشت سے ٹکاتے ہوئے اشتیاق جھٹکے سے اٹھے۔

''میرا بیگ''

وہ شولڈر بیگ جس میں ان کے اور میرے پاسپورٹ سمیت تمام کاغذات موجود تھے۔

وہیں کوچ رکوا کر اترے اور ہم تو منٹوں سیکنڈوں میں باب فتح کے قریب اتر گئے، یہ پیدل واپسی کے سفر پر.....بس ایک دعا ہی ہتھیار رہ جاتا ہے بے بسی میں۔ کچھ تڑپ بھرے الفاظ بھی.....

''اللہ جی ایک تو ہم مسافر، پردیسی اور دوسرے تازہ تازہ حاجی.....کرم کریں ،رحم کریں۔امی والا ٹوٹکا بھی استعمال کیا کہ ہر منٹ کے بعد منت کے نوافل اور پیسوں کی رقم بڑھائی گئی۔ بالآخر جب حرم میں داخل ہوگئے تو جاوید بھائی (شازیہ کے میاں) کو ان کی کال آئی کہ بیگ وہیں سے مل گیا ہے جہاں ہم سانس لینے کو رکے تھے۔

''اللہ تیرا شکر ہے، باجی! میں نے تو بیس ریال اور نوافل کی منت مان لی تھی۔'' شازیہ نے بے ساختہ کہا۔

پھر اپنے اور اپنے رب کے محبوبؐ کی حدیث یاد آ گئی اور اس کی سمجھ بھی آئی کہ کیوں کہا گیا ہے کہ حاجیوں

کی گری ہوئی چیز نہ اٹھائی جائے۔صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

شکرانے کے نوافل ادا کیے،عصر کی نماز حرم میں باجماعت ادا کر کے شازیہ کی بلڈنگ میں انکے مہمان بنے،کھانا کھایا ان کے اہالیان بلڈنگ سے ملاقات کر کے اپنی بلڈنگ میں پہنچے تو عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔نماز ادا کی۔چائے کے ساتھ پیناڈول لے کر حج کے مکمل ہونے پر مبارکباد کے میسجز پڑھے۔اللہ کے شکر کے ساتھ بستر پر دراز ہوئے کہ تھکن بے حساب تھی۔ ان کا تو مجھ سے بھی برا حال کہ بیگ ڈھونڈنے کے لئے پیدل جانا اور واپس آنا پڑا۔ یہ یقین ہے کہ اس ذہنی اور جسمانی اذیت پر اللہ نے کمیاں بیشیاں دور کی ہوں گی اور گناہ بخشے ہوں گے۔

مکہ میں قیام کے دوران بارھا ''قریش مکہ'' ہی یاد آئے۔لہجے میں قدرے تلخی بلکہ درشتگی کا عنصر نمایاں ہوتا۔ایک آدھ دفعہ دور جاہلیت والی ''رعونت'' کی جھلک بھی دیکھی۔کہیں کہیں عمرؓ بن خطاب کا جلال بھی نظر آیا۔ حسرت ہی رہی یاالٰہی کیا ابوبکرؓ صدیق کے جانشین نظر نہیں آئیں گے؟؟ خلیفہ اول کا حلم اور انکساری کہاں رہ گئی۔

لیجیے جناب! کہیں نہیں گم ہوئی۔مل گئی۔ وہ بھی کہاں بارہ ذی الحج کی سڑی چلچلاتی دھوپ میں جمرات سے واپسی پر میاں صاحب کو کسی نے بتایا کہ مسجد خیف کے قریب کسی ہوٹل سے افغانی روٹی ملتی ہے۔جمرہ سے واپسی پر مسجد خیف کے قریب انہوں نے مجھے لمبی چوڑی سڑک کے کنارے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں اس سرکاری عمارت کے چھوٹے سے شیڈ کے نیچے کھڑی ہو جاؤ میں ابھی افغانی روٹی لے کر آیا۔''

میں نے پسینے سے بھیگے گاؤن اور سکارف پر نظر ڈالی،جو پسینے سے میلو میل ہو رہے تھے اور چاروں طرف سورج آگ برسا رہا تھا۔

میری پشت پر ایک سرکاری عمارت تھی جہاں ایک بائیس تئیس سالہ شرطہ اور ایک معمر جوڑا موجود تھے۔ چوتھے بندے کی گنجائش پیدا کرتے ہوئے شرطے نے مجھے وہاں بیٹھنے کی پیشکش کی لیکن میری ہچکچاہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ بی بی نامحرم کی وجہ سے بیٹھنے سے معذور ہے۔ بیچارہ شرما کر پیچھے دھوپ میں کھڑا ہو گیا۔اور میں اس کی جگہ پر یعنی چھاؤں میں چلی گئی۔

میرے دائیں طرف دونوں میاں بیوی روانی سے پشتو بول رہے تھے اور اس سے کہیں زیادہ تیزی سے

شڑاپ شڑاپ چائے پی رہے تھے مجھے ''لوہا،لوہے کو کاٹتا ہے'' والا محاورہ یاد آ گیا۔لیکن میرے دل میں ٹھنڈی ٹھار ذائقے دار مرنڈا کی خواہش پیدا ہوئی۔

اتنے میں خاکروب آیا تو شرطے نے اسے بلا کر ''جنتیوں'' کی زبان عربی میں بارد مرنڈا (ٹھنڈی ٹھار مرنڈا) لانے کو کہا۔میرا ہاتھ بے اختیار پرس کی طرف گیا۔

اتنے میں دونوں خیبر پختونخوا ہوں نے اسے دس ریال پکڑائے اور اثنین بارد بیپسی (دو پیپسی) کا آرڈر دیا۔

میں نے تیزی سے پرس سے دس ریال نکالے۔

شرطہ میرے پاس آیا اور میری ڈیمانڈ پوچھنے لگا۔

''واحد بارد مرندا'' میں نے کہا اور پیسے پکڑائے۔

''لا،لا'' کہتے ہوئے پیسے اس نے واپس کر دیئے اور خاکروب سے مغز ماری شروع کر دی۔

''اثنین بارد مرندا،اثنین بارد بیپسی''

خیر خاکروب پیسے لے کر چلا گیا اور دونوں پٹھان میاں بیوی اس شرطے کی تعریف کرنے لگے۔

ارے واقعی، میں نے جائزہ لیا، بیچارا نو دس منٹ سے مجھے چھاؤں میں بٹھا کر خود دھوپ میں سڑ رہا ہے میں نے نوٹ کیا۔

اتنے میں ایک اور ''شرطہ بہادر'' آیا اور ڈانٹ ڈپٹ کر اس عمارت کے سائے سے اٹھانا چاہا۔لیکن ہمارے والے شرطے نے ''ضیوف الرحمٰن'' کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا اور وہ بیچارا پھر دھوپ میں دائیں سے بائیں چکر لگانے لگا۔اس عرصہ میں جو بھی بھولا بھٹکا جمراہی آ کر راستہ پوچھتا وہ پاکستانیوں کو ہمارے حوالے کر دیتا اور باقیوں کو بڑی نرمی سے راستہ سمجھاتا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد اشتیاق صاحب ناکام واپس آئے اور مجھے اٹھنے کا کہا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا ''آج میرا بھائی مجھے ٹھنڈی مرنڈا پلانے لگا ہے۔''

انہوں نے مسکرا کر شرطے کی طرف دیکھا اور وہیں کھڑے ہو گئے۔

''شمس، شمس''، شرطے نے دہائی دی۔

اور ساتھ ہی پٹھانوں کو ذرا سکڑنے سمٹنے کا کہا اور ایک بندے کی گنجائش نکالی۔اشتیاق بدستور دھوپ میں کھڑے تھے۔ان کی نویں نکور ٹنڈ کی طرف شرطے نے پریشانی سے اشارہ کیا۔

''شمس، حرّہ'' (دھوپ میں ٹنڈ جل جائے گی)

اشتیاق صاحب اس کی بے تابی دیکھ کر چھاؤں میں بیٹھے اتنے میں ٹھنڈی مرنڈا بھی آ گئی۔ہدیۃً، تقبل کی پکار

کے ساتھ۔اور میرے دل میں اس کے لئے دعائیہ کلمات
تھے۔

''یقیناً کسی نیک ماں کا بیٹا ہے!''

☆☆☆

شمیم فاطمہ

صبح قریب آ لگی ہے

ایک شیرازہ ہے جو بکھر گیا ہے.....ایک مالا ہے جو ٹوٹ گئی ہے.....مگر.....یہ منظر اب تبدیل ہونے کو ہے۔

ہم اپنے اس وجودِ خاکی و فانی پر جو دلِ خانہ خراب اٹھائے پھرتے ہیں، وہ بچارہ ہماری خواہشوں اور آرزوؤں کا ناقابل برداشت بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ وہ ہماری بقائے حیات کے لیے اس خون کو (جو ہمیں خون خرابے پر مائل رکھتا ہے) تن داغ داغ کے تمام اضلاع میں سپلائی کرتا رہتا ہے اور اس کارِ مسلسل سے پسینے پسینے ہوتا رہتا ہے مگر ہم ہیں کہ اس غریب پر اضافی بوجھ لادے چلے جاتے ہیں (بچارہ ایک نجی کمپنی کے ملازم کی طرح اضافی محنت مشقت کرتا رہتا ہے، صاحب کی خدمت میں لگا رہتا ہے تاوقتیکہ وہ معین دن نہ آ جائے) ہم اپنے اس دل پرخوں میں خواہشات یوں ٹھونس ٹھونس کر بھرتے ہیں جیسے ویگن ڈرائیور سواریاں ٹھونس ٹھونس کے بھرتا ہے یا بے سلیقہ بیبیاں الماری میں کپڑے ٹھونس ٹھونس کے رکھتی ہیں۔ خواہشوں کی اس لمبی قطار کو دیکھ کر یوں گماں ہوتا ہے کہ دل نہ ہوسی این جی اسٹیشن ہو..... اس اسٹیشن کو ہم خواہشوں کے چائنا بلب سے روشن کیے رکھتے ہیں، (جہاں ایک بلب فیوز ہوا دوسرا لگا دیتے ہیں) وہ فرمائش کرتا ہے ہم پوری کرتے ہیں.....کبھی کبھی تو دل کی فرمائش با آسانی پوری ہو جاتی ہے ہلدی پھٹکری لگائے بغیر، کبھی کبھی خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، کبھی دھرنے، مظاہرے کرنے پڑتے ہیں، کبھی اس سے بھی کام نہیں بنتا تو ہم دھمکی پر اتر آتے ہیں کہ "اگر ہماری یہ خواہش پوری نہیں کی گئی تو ہم زہر کھالیں گے!" (ہم سے ڈرنے والے قتل کے الزام سے ڈر کے بادلِ نخواستہ بات مان ہی لیتے ہیں اور ہماری خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔)

کچھ خواہشات تو خودرو پودوں کی طرح اگتی اور مرجھا جاتی ہیں، (ہمارے سر پر سوار نہیں ہوتیں) کچھ خواہشیں گداگر کی طرح دامن سے لپٹ جاتی ہیں..... (سوال کرنے لگتی ہیں کہ "اللہ تمھیں مکے مدینے کی سیر کرائے، تمھارے بچوں کو چیف منسٹر بنائے، اللہ کے نام پہ کچھ مدد کرو، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں!!")

یوں تو زندگی میں بہت سی خواہشات ہمارے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں لیکن اللہ کے فضل و کرم سے جب یہ خواہشات پوری ہو جاتی ہیں تو پھر ہماری بیگانگی، ہماری بیزاری، ہمارا اطمینان، ہماری بے توجہی قابل دید

ہوتی ہے ..... ہم بڑے ارمانوں اور شوق سے نیا جوڑا خریدتے ہیں مگر دو دفعہ استعمال کرنے کے بعد ہی اس سے جی بھر جاتا ہے اور نگاہوں میں ایک نیا جوڑا اپنی چھب دکھانے لگتا ہے.....ایک نئی سینڈل کی خواہش دل میں اس شد و مد کے ساتھ ابھرتی ہے کہ لگتا ہے کہ سینڈل نہ ملی تو ہم کہیں نہ رہیں گے.....اور سینڈل خریدنے کے بعد ہم اس کا وہی حشر کرتے ہیں جو اس سے پہلے خریدی گئی سینڈلز کا کر چکے ہوتے ہیں (یعنی سجا کر رکھ دیتے ہیں، تاکہ رکھے رکھے بھول جائیں اور نئی سینڈل کی خواہش ستانے لگے۔)

بچے کا اسکول میں ایڈمشن کروانا ہو تو راتوں کی نیند حرام کر لیتے ہیں کہ مطلوبہ اسکول میں ایڈمشن ہو بھی سکے گا کہ نہیں۔ کبھی ان سے کہتے ہیں کبھی اُن سے کہتے ہیں، ایڈمشن فیس کے لیے جوڑ توڑ کرتے ہیں، ٹیسٹ کی تیاری کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں.....مگر جب بچے کا داخلہ ہو جاتا ہے تو وزیر داخلہ کی طرح مطمئن ہو جاتے ہیں کہ

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

نہ بچے کی سرگرمیوں کی خبر رکھتے ہیں ، نہ نصابی مشکلات کی۔

جب بہو ڈھونڈنے نکلتے ہیں تو چندے آفتاب، چندے ماہتاب سے نیچے نہیں اترتے .....بہو کی صورت میں خیام کی رباعی ڈھونڈتے ہیں۔ کترینہ کی طرح الہڑ، مادھوری کی طرح ہنس مکھ، سشمیتا کی طرح لمبی، ریکھا کی طرح سدا بہار، کرینہ کی طرح طرحدار، ایشوریہ کی طرح سمجھدار.....سلیقے میں طاق، ہنر میں یکتا، تعلیم میں نمایاں، حسب نسب، مال و دولت میں لاثانی.....ایسی گوہر نایاب کو بہو بنانے کے بعد ہم اس کی ایسی درگت بناتے ہیں جیسی سپر پاور ہماری بناتا ہے (یا پھر اس سے درگت بنواتے ہیں)۔

نہایت اچھی کتاب خرید کے لاتے اور لانے کے بعد بک شیلف میں سجا دیتے ہیں اور انتظار کرتے رہتے ہیں ایک ایسی فرصت کا جس میں اطمینان سے بیٹھ کے پڑھ سکیں۔ ہماری بے توجہی اسے دیمک کی غذا بنا دیتی ہے۔ مہنگے مہنگے گملے، پودے خرید کے لاتے اور ان سے یوں بے نیاز ہو جاتے ہیں جیسے اپنی ہر عزیز ہستی سے ہو جاتے ہیں۔

گھر بنانے سے پہلے سب سے پہلے تو ہمیں ایک گھر کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے..... جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دھوپ، بارش، سردی، گرمی

سے بچنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھکانہ تو ہے ہی نہیں ..... جہاں پڑاؤ ڈالتے ہیں وہاں سے ہمیں کوئی چلتا کر دیتا ہے ..... ہم کھانسیں تو اعتراض ..... ہم گائیں تو اعتراض .....ہم کچھ پکائیں تو اعتراض (کہ خوشبو سے کسی کی بھوک چمک جاتی ہے) جب یہ نکتہ چینیاں نکتے سے بڑھ کر ایک بڑا دھبہ بننے لگتی ہیں، ہمارا جینا تنگ کر دیتی ہیں تو ہمیں یہ طے کرنا ہی پڑتا ہے کہ ''اک گھر بنانا چاہیے!'' چنانچہ یہ خبر سب کے گوش گزار کر دی جاتی ہے کہ ہم بھی ایک گھر کے آرزومند ہیں۔ سب سر جوڑ کے بیٹھتے ہیں اور طے پاجاتا ہے کہ ''ایک گھر ناگزیر ہے۔''

چنانچہ تحریک شروع ہوجاتی ہے۔ سب مل کر تنکا تنکا جوڑنا شروع کر دیتے ہیں، ایک امنگ، ایک لگن دلوں کو آمادۂ مشقت کرتی ہے۔ بھوک، پیاس، آرام، سکون، گھر بار، کھیت، باغات، جان و مال سب وارنے کے لیے تیار .....بس گھر بن جائے! آگ اور خون کا دریا عبور ہو گیا، سود و زیاں کا حساب برابر ہو گیا، گھر بن گیا!! گھر بنانے کے عمل میں ہم اس قدر تھک گئے کہ گھر کا دروازہ بند کیے بغیر ہی بے سدھ ہو کر سو گئے۔ گھر بنانے کے اغراض و مقاصد بھول گئے، وعدہ و پیمان بھول گئے، گھر کی بنیادیں اٹھانے والے اس جہد پیہم کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی اپنی آرام گاہوں میں محو استراحت ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جس کی چیز ہوتی ہے وہی اس کا قدردان بھی ہوتا ہے..... ورنہ مال مفت دلِ بے رحم۔

آدمی اپنی محنت کی کمائی سے مٹھائی کی جگہ صابن کی ٹکیہ بھی خرید لائے تو اسے محض اس لیے کھا جاتا ہے کہ یہ ٹکیہ مفتے کی تو نہیں آئی!! چنانچہ اتنے بڑے جیون ساگر میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو گھر عطا کیا ہم نے اس کا بھی وہی حال کیا جو دیگر چیزوں کا کرتے آئے ہیں۔

ایمان، اتحاد اور تنظیم، اماں کے جہیز کا پاندان، اگلدان اور عطردان کی طرح گھر کے مکینوں کی نظر التفات کے منتظر! پڑے پڑے آؤٹ آف فیشن ہو گئے اور بالآخر کوڑیوں کے مول بیچ دیے گئے۔ گھر میں کون آ رہا ہے؟ کون جا رہا ہے؟ کس چیز کی کمی واقع ہوئی ہے؟ کون سی چیز قابل مرمت ہے؟ کون من مانی کر رہا ہے؟ کون بے ایمانی کر رہا ہے؟ کس کی خودسری بڑھتی جا رہی ہے؟ کس کے حقوق غصب ہو رہے ہیں؟ کون دیواریں اٹھا رہا ہے؟ کون نقب لگا رہا ہے؟ کون اپنا چولہا الگ کرنا چاہ رہا ہے؟ کون اپنے نام کی تختی لگا رہا ہے؟ کون کانٹے بو رہا ہے؟ کون کیاری اجاڑ رہا ہے؟؟.....گھر میں ایک بھونچال سا آیا ہوا ہے.....سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا!.....ایک دوسرے سے خفا خفا

.....ایک دوسرے سے دور دور!.....اپنے اپنے مسائل میں الجھے.....اپنی اپنی خواہشوں میں مگن!.....اپنے اپنے غموں سے نڈھال.....سب کے دسترخوان الگ.....سب کے پیمانے الگ، جام الگ.....سب کی ڈفلی الگ! سب کے راگ الگ.....!! یہ گھر اپنے بنانے والے سے فریاد کناں ہے کہ.....کوئی پرسانِ حال ہو تو کہوں.....کیسی آندھی چلی ہے تیرے بعد.....دن گزارا ہے کس طرح میں نے..... رات کیسے ڈھلی ہے تیرے بعد..... میں تو مشکل سے آہ بھرتا ہوں.....(شہر قائد سے جب گزرتا ہوں!)

ایک شیرازہ ہے جو بکھر گیا ہے.....ایک قوم ہے جو ہجوم بن گئی ہے (ہجوم بظاہر اکٹھا ہوتا ہے مگر سب کی منزلیں مختلف ہوتی ہیں).....ایک مالا ہے جو ٹوٹ گئی ہے.....ایک محبت ہے جو روٹھ گئی ہے.....ایک پہاڑ ہے جو ریزہ ریزہ ہو گیا ہے .....ایک سمندر ہے جو دریاؤں، تالابوں، جھیلوں اور جوہڑوں میں بٹ گیا ہے.....ایک روح ہے جو جسم سے بچھڑ گئی ہے .....مگر.....

یہ منظر اب تبدیل ہونے کو ہے ..... کہ فصل گل خزاں کے جبر سے آزاد ہونے ہی والی ہے، چمن کے حدود میں داخل ہی ہوا چاہتی ہے.....ایک ستارہ، شام کا پہلا ستارہ بننے کے لیے اپنے مدار سے چل پڑا ہے..... ایک امید مایوسیوں سے اعلانِ جنگ کر چکی ہے.....فضا میں نعرۂ تکبیر گونجنے ہی والا ہے .....صبح بس قریب ہی آ لگی ہے..... (کہ رحمت کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے جہاں جبر کی انتہا ہو جاتی ہے!)

☆☆☆

خوشبو کا سفر

انسانی ذہن کی نوعیت بھی کچھ عجیب ہی ہے۔ گزرے بیتے وقتوں کی یادیں اور باتیں مدتوں اس میں خوابیدہ رہا کرتی ہیں لیکن وقت کی کسی کروٹ سے سب انگڑائی لیکر بیدار ہوجاتی ہیں۔ گاہے خوشی وانبساط اور گاہے گہرے غم سے دوچار کرنے کے لئے۔

اس حوالے سے میں ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ کرنے چلی ہوں جس سے قربتوں کے بے شمار واسطے موجود تھے اور اس لئے میں ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی چشم دید گواہ رہی ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ میری امی کی پھوپھو کی بیٹی تھیں۔ اور چونکہ امی اپنی پھپھو، خالاؤں اور ان کی اولادوں سے بے تحاشا پیار کرنیوالی ہستی تھیں اس لئے میرے بے روک ٹوک ان کے پاس جانے آنے میں کوئی رکاوٹ مانع نہیں تھی۔ سکول میں داخلہ دلوانے سے قبل قرآن کی تعلیم دلوانے کا اہتمام کیا گیا۔ ہماری گلی میں ایک گھر چھوڑ کر دوسرا گھر جو ہمارے آباواجداد کی اولین رہائش گاہ اور جس میں کئی کنبے رہائش پذیر تھے وہ اسی میں رہتی تھیں۔ مکان کی چنائی گارے اور اینٹوں سے کی گئی تھی۔ اس گھر میں ہمارے آباواجداد سے اب تک کئی نسلیں زندگی گزار چکی تھیں ایک کمرے میں کپڑے کا جہازی سائز پنکھا لگا ہوا تھا، جسے گھر کی وفادار ملازمہ ہلایا کرتی اور گھر والے گرمیوں کی تپتی دوپہر میں بغیر اے سی اور کولر پرسکون نیند سویا کرتے۔ اس دور میں یہ ایک معمول کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اس گھر میں قرآن مجید پڑھنے کیلئے روزانہ آتی۔ وہ مجھے کبھی ٹافیاں کھلاتیں، کبھی کھٹا مسالہ بنا کر اس کی پڑیا پکڑاتیں۔ ان کی دی ہوئی پلاسٹک کی رنگین انگوٹھیاں آج بھی مجھے یاد ہیں۔ بچپن کے سنہرے، سہانے دن کب بھلا بھولتے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ وہ مکان ڈھا دیا گیا۔ ہماری ہم دیوار ہمسائی بن کر وہ اور نزدیک ہوگئیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اہم وصف محبت تھا ہمارے گھر دادی جان ان کی شیدائی بن گئیں۔ دیر تک ان کی محفل باہم جمی رہتی۔ کبھی وہ امی کو ڈھیروں دلچسپ باتیں سناتیں۔ سکول اور پھر کالج کے قصے۔ ان کی سہیلیوں کی باتیں، اساتذہ کی

باتیں۔نانی اماں کا گھر کئی گلیوں کے فاصلے پر تھا۔جب بھی ان کا آنا ہوتا امی سے زیادہ وہ ان کے ساتھ وقت گزارتیں۔اس وقت ان کی شادی ہوچکی تھی۔بچے اس وقت سکول میں ہوتے ہوں گے۔یا چھوٹے بچے ان کے پاس ہوتے ہوں گے۔بہر حال وہ وقت نکال لیتیں۔گھر کی دھوبن، ماسی سبھی ان کے والہ وشیدا تھے۔کڑھائی اور بنائی میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔بی اے پاس کرنے پر انہوں نے بہت پیارے کشیدہ کئے ہوئے رومال تحفہ میں دیئے جنہیں پا کر مجھے ازحد خوشی ہوئی۔ایک خوبصورت سی گلابی رنگ کی ڈبیہ جس میں گلابی ہی پاؤڈر اور پف بھی موجود تھا اس کے علاوہ تھے۔

یادوں کا ایک انبار ہے جو اُمڈتا چلا جاتا ہے۔ان کی شادی کی تاریخ مقرر کی گئی تو اس وقت ان کے بی اے کے پرچے ہونیوالے تھے۔وہ اس بات پر بہت برافروختہ تھیں کہ کسی کو ان کے امتحانات کی پرواہی نہیں۔پھر یوں ہوا کہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر ان کی شادی کچھ عرصے کیلئے ملتوی ہوگئی۔یہ پرمسرت موقع پھر چند سال بعد ہی آیا۔مینڈھی، مہندی، شادی، ولیمہ چار دن یہ فنکشن جاری رہا تھا اور میں ان کے ساتھ ہی چپکی ہوئی تھی۔جس کمرے میں وہ رہائش پذیر رہیں اس میں مہندی، پھولوں اور عطر کی خوشبو رچ بس گئی۔اسی کمرے میں ان کو دلہن بنایا گیا تھا نا۔میں روزانہ وہاں جاتی کمرہ کھول کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتار لیتی اور پھولوں کی ایک خوشبو وہ تھی جو مرنے کے بعد دوسرے دن ان کی چادر جھاڑنے پر سوکھی گلاب کی پتیوں میں سے نکلی۔موت کتنی عجیب چیز ہے ہر انسان نے مرنا ہے اور اپنی موت سے پہلے کتنی میتوں اور جنازوں کو دیکھنا پڑتا ہے لیکن اس کی ہیبت اور عجب سے نجات ممکن نہیں۔

ان کی موت سے تھوڑا پہلے میں بیمار پڑ گئی۔ان کے مرنے کے بعد بیماری نے ایسا جکڑا کہ خاصا طول پکڑ گئی۔میرا دل چاہتا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں اور کسی کے گلے لگ کر دل کا غبار نکالوں۔شاید وہ غبار بھی جو اپنی والدہ اور پھر والد کی وفات پر میرے اندر جما ہوا تھا، اس موقع پر راہ پا گیا تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔

وہ اتنی اچھی اتنی پرخلوص تھیں۔ان کا ایک احسان تو مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گا۔میری ایک بیٹی پیدا ہونے کے تیس گھنٹوں بعد وفات پا گئی۔وہ رات میرے لئے بہت کربناک تھی۔اس کا ایک ایک لمحہ میرے لئے دکھ بھرا تھا۔امی اور وہ تمام رات میرے

ساتھ مل کر میرے کتنے کام سرانجام دیتیں۔ بستر کی چادر بدلنا، کنگھی کرنا، کپڑے تبدیل کروانا وغیرہ۔ آج ان کی وفات سے تین سال بعد یہ باتیں ان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر مجھے یاد آ رہی ہیں۔ اس میں شامل سبھی لوگ رشتہ دار، ہمسائے، دوست، ملازمائیں بیک وقت خوش اور افسردہ ہیں۔ خوشی شادی کی اور افسردگی اس بات کی کہ وہ اپنے ہاتھوں یہ خوشگوار فریضہ سرانجام نہ دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بچوں کو شاد و آباد رکھے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

☆☆☆

نینوسیکنڈ

میرا چھوٹا بھائی ڈاکٹر مستحسن میر گزشتہ کئی سالوں سے متحدہ عرب امارات میں اجمان یونیورسٹی کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی کردار سازی سے خصوصی دلچسپی رکھتا ہے۔

ایک دن اس نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ ''آج میں تم سب کو ایک انوکھی پیش کش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے پاس ایک باریک سوئی ہو اور میں تم سب کو باری باری وہ سوئی صرف ایک نینوسیکنڈ کے لئے چبھونا چاہوں اور تم سب بخوبی جانتے ہو کہ ایک سیکنڈ کے سو کروڑویں حصے کو نینوسیکنڈ کہتے ہیں، تو تم میں سے جو شخص بھی بخوشی اس کام کے لیے آمادہ ہو جائے گا تو سوئی چبھونے کے بعد میں اسے بطور انعام پانچ سو ڈالر دوں گا۔ اب خوب سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ تم میں سے کون کون میری اس پیش کش کو قبول کرنا چاہتا ہے؟''

اس کی ساری کلاس نے فوراً اپنے ہاتھ بلند کر کے منظوری کا عندیہ دیا۔

مستحسن نے حیرت سے کہا۔ ''بھئی اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرو۔ کیونکہ سوئی چبھنے کا عمل تکلیف دہ ہے۔ تم سب اس تکلیف کو بخوشی کیوں مول لینا چاہتے ہو؟''

سب شاگردوں کا ایک ہی جواب تھا۔ ''سر! اس لئے کہ اتنے بڑے انعام کے سامنے اتنی معمولی تکلیف کی کوئی اہمیت نہیں۔''

مستحسن کہنے لگا۔ ''میرے عزیز بچو! اس دنیا کی تمام تر تکالیف، پریشانیوں اور آزمائشوں کی بھی آخرت کے بے پایاں اجر و انعام کے سامنے قطعاً کوئی حیثیت نہیں۔ یہاں کی تمام تر مشکلات عارضی اور فانی ہیں اور وہاں کے تمام انعامات ابدی۔ آخرت کی ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی زندگی کے مقابلے میں اس دنیا کی ساٹھ، ستر سالہ اوسط عمر کی وقعت صرف ایک نینوسیکنڈ کی سی ہے۔ اس لیے تمہیں جب بھی کسی مشکل، بیماری یا آزمائش کا سامنا کرنا پڑے تو اس امید کے ساتھ کرو کہ تمہاری ہر تکلیف کے بدلے تمہارے لیے بہترین اجر جمع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہر مشکل کا سامنا اس

انتظار کے ساتھ کرو کہ جلد ہی وہ دن آنے والا ہے جب تمہیں تمہاری توقع سے بہت بڑھ کر نوازا جائے گا اور اپنے ہر غم کا سامنا اس یقین کے ساتھ کرو کہ مشکل کی اس گھڑی میں تم اکیلے نہیں۔ ایک ذات ہے جو تمہیں دیکھ رہی ہے۔ جو تمہارے ساتھ ہے۔ جو تمہاری خیر خواہ ہے۔ جو تمہاری ہر آہ کا محبت بھرا جواب دے رہی ہے اور تمہیں عنقریب اپنی رحمت کے گھیرے میں لینے والی ہے۔''

میں چونکہ بے حد کمزور ہوں اس لئے زندگی میں جب بھی مشکل مقام آتا ہے، میری ہمت ماند پڑنے لگتی ہے۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط ہونے لگتا ہے۔ معمولی سا غم بھی آناً فاناً کوہ ہمالیہ کی طرح بلند ہو کر میرے سینے پر براجمان ہو جاتا ہے کہ اچانک اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مستحسن کی مذکورہ بالا بات میرے دل میں امید کی کرن بن کر اترتی ہے اور پھر میرے دل کی گھڑی میں سے صدائیں بلند ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

''دھک، دھک، دھک، ٹن، ٹن، مانا کہ یہ کٹھن گھڑی ہے۔ مانا کہ یہ بے حد دشوار مرحلہ ہے۔ مانا کہ ضبط کے بندھن کا تانا بانا بکھر جانے کا ڈر ہے۔ مانا کہ دل کے کرچی کرچی ہو کر منتشر ہو جانے کا خوف ہے لیکن اک ذرا سا صبر اور، اک ذرا سا انتظار اور، تھوڑا سا ضبط اور، کچھ امید اور، کچھ یقین محکم اور، ایسا پختہ ایمان اور کہ جس نے تجھے اتنی چاہت سے تخلیق کیا ہے، کیا وہ بلاوجہ خود ہی تجھے ضائع کر دے گا۔ نہیں، کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔ بس ذرا جم جا، حوصلے سے کام لے، ہمت کے پتوار تھام لے۔ یہ لمحہ تو مہمان بن کر صرف ایک نینو سیکنڈ کے لیے تیرے گھر کے آنگن میں اترا ہے اور ابھی دیکھتے ہی دیکھتے تیری جھولی میں بے شمار انعامات ڈال کر کہیں دور پرواز کر جائے گا۔ اپنے مہمان کا اکرام کر۔ اس سے کوئی گلہ شکوہ نہ کر۔ دل چھوٹا نہ کر۔ بس صبر وضبط سے اپنی جان پر جھیل جا کہ یہ صورتحال تو ایک نینو سیکنڈ کے لیے ہے.....صرف ایک نینو سیکنڈ کے لیے!

☆☆☆

دل ایک کشکول

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔کسی کا یہ فقرہ آج بار بار میرے ذہن میں گونج رہا ہے۔ نہ جانے کیوں؟.....کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے کوئی بات یاد آنے لگتی ہے.....اور پھر آتی چلی جاتی ہے۔ شاید نہیں بلاوجہ تو کچھ بھی نہیں ہوا کرتا۔ آج یہ بات مجھے اس لئے یاد آرہی ہے شاید..... ہاں شاید اس لئے کہ آج میرا دل بہت اداس ہے، میرے اندر عجیب ٹوٹ پھوٹ ہورہی ہے۔ایک گھٹن ہے جس نے میری سانس دوبھر کررکھی ہے۔اک عجیب سی بے چینی نے مجھے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ میں کتنی ہی دیر سے کتابیں لیے بیٹھی ہوں لیکن..... ہر سطر ہر حرف میرے اوپر سے گزرتا چلا جارہا ہے۔نظر کو بڑی مشکل سے کتاب پر ٹکاتی ہوں مگر کچھ دیر بعد ہوش آتا ہے تو یہ پھر خلاؤں میں بھٹک رہی ہوتی ہے پتہ نہیں یہ خالی نظریں فضا میں کیا تلاش کرتی ہیں؟ بھلا ان فضاؤں کے پاس ہمیں دینے کو کیا ہے پھر بھی..... پھر بھی..... نامعلوم ہر مسئلے کے حل کے لئے نظریں خلاؤں میں کیوں بھٹکتی پھرتی ہیں حالانکہ متنفس تو زمیں پر ہیں.....محبت کرنے والے..... ہمدردی کرنے والے.....زندگی کی کٹھن راہوں میں معاونت کرنے والے.....

طبیعت اس قدر اداس ہے کہ.....دل چاہتا ہے کوئی..... بہت پیاری سی ہستی ہو جس سے میں اتنی باتیں کروں.....اتنی باتیں کروں کہ ساری فکریں اور پریشانیاں دور ہوجائیں.....کوئی عزیز ساتھی جو ان لمحوں کے کرب آمیز زخموں پر پیار کا مرہم رکھ دے..... کرچی کرچی ہوتے دل کو تھام لے.....جو میری پلکوں کے موتی ضائع ہونے سے بچالے..... اپنے دامن میں سمیٹ لے، ہاں.....کوئی..... جو درد و کرب کے اس حصار کو توڑ کے میرے قریب آجائے۔ اور میری زندگی کے سارے خلا پر کردے۔میری ویران زندگی کو دل نشین اور میٹھے بولوں کی ہریالی سے بہاریں بخش دے.....دل تلاش کرتا ہے کوئی سخی.....جو میرے خالی کشکول میں محبتیں ڈال دے..... پیار ڈال دے اتنا..... اتنا کہ..... میری گداگری عمر بھر کے لئے تھم

جائے..... مجھے سکون کی دولت مل جائے اور زندگی کے دھارے صراط مستقیم پہ بہنے لگیں۔

کسی آہٹ نے چونکا دیا شاید..... میری سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا ہے..... میری نظر زمیں پہ آ گئی ہے..... تمناؤں کا بلند و بالا محل..... فضا میں معلق ہے..... میں اپنے چاروں طرف دیکھ رہی ہوں..... کتنے ہی لوگ ہیں..... کتنے ہی زیادہ مگر..... سب جھکے کسی نہ کسی کام میں مصروف ہیں۔ان کے چہروں پر تھکن اور محنت کے آثار ہیں، اپنے کاموں میں مصروف ہیں، ان کی زندگیاں بہت مصروف زندگیاں ہیں۔ان کے پاس نظریں اٹھانے کی بھی فرصت نہیں..... ہر گزرتا لمحہ ان کی مصروفیت میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے..... شاید وہ اپنے ساتھ بہت دیانتداری کرتے ہیں وہ لمحہ لمحہ استعمال کرتے ہیں لیکن..... لیکن میں کیا کروں..... میرے اندر انسان سسک رہا ہے..... تڑپ رہا ہے..... بے تاب..... کہ کوئی تو نظر اٹھائے کوئی تو میرا حال زار دیکھے۔کوئی تو میری آنکھوں کی نمی محسوس کرے۔کوئی تو میرے رب.....! انسانوں کی اس بستی کے درمیان میں تنہائی کا شکار ہوں..... میں اکیلی ہوں..... کتنے عرصے سے..... کتنی عمر سے..... ان لوگوں کو کب فرصت ملے گی..... کب..... میرے خدا.....!

سنو! جب کسی سے تعلق کا دعویٰ ہوتا ہے تو اس کا وقت مانگا جا سکتا ہے۔تم کہہ کے تو دیکھو..... شاید وہ تمہاری خاطر وقت نکال لے، قلب نے سرگوشی کی..... میں نے لمحے بھر کو سوچا..... کہ اس کا دامن جا پکڑوں جو میری زبان سمجھ سکتا ہے..... میرے درد بٹا سکتا ہے..... اس سے قبل میں کوئی قدم اٹھاتی عقل آڑے آئی۔صدا آئی کہ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم..... تم..... محض اپنی ذات کی خاطر کسی کے قیمتی وقت کے ضیاع کا باعث بنو.....

وہ پیار، پیار نہیں ہوتا اے جانِ عزیز جو مانگ کر لیا جائے۔وہ بول خالص نہیں ہوتے جو طلب کرنے پر ملیں..... تم اس روح کی پیاس یوں نہ بجھا پاؤ گی..... تمہاری تنہائیاں یوں نہ دور ہوں گی۔

بے بسی سے میری آنکھیں چھلک پڑیں..... میرے آنسو خاک میں جذب ہونے لگے..... کسی شہید کے لہو کی طرح..... آنسو خاک میں ملتے رہے..... لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے..... جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا کہ ایک خیال نے مجھے چونکا

دیا۔

''اس زمیں میں نہ جانے کس کس کے اشکوں کے موتی رُل رہے ہوں گے..... جانے کون کون میری طرح بے بسی سے رو دیا ہوگا، التفات کی چند نظروں کی طلب میں..... پیار کے چند بولوں کے انتظار میں!

میں نے چونک کر سر اٹھایا..... اک بار پھر اپنے آس پاس دیکھا..... سب کے چہروں پر تھکن کے آثار تھے..... میں نے اور غور کیا..... میرے ساتھی کچھ کھوئے کھوئے تھے..... کیا مطلب؟ میں اک بار پھر سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ یہ سب بھی کھوئے کھوئے ہیں..... کیا یہ بھی تنہائی محسوس کرتے ہیں؟ کیا ان کے دلوں میں بھی کوئی دکھ ہیں؟ کیا ان کی آنکھ بھی کسی التفات کی منتظر ہے.....؟

میرے آنسو رک گئے..... میری سوچ کے دھارے مڑ گئے..... کہیں ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار تو نہیں؟ کہیں یہ اس لئے اداس تو نہیں کہ میں اپنی سوچوں میں گم ہوں..... کہیں یہ میری توجہ کے طالب تو نہیں..... میرا سر ندامت سے جھک گیا..... کہ..... میں..... جو خالی کشکول لیے شکوہ سنج ہوں..... خود اپنے خزانے کہاں چھپا رکھتی ہوں..... میری توجہ..... میری محبت..... میری سوچیں..... یہ سب کس کے لئے ہیں.....؟ کہاں ہیں.....؟ بخل کی کوئی انتہا ہوتی ہے..... اپنی ساری دولت صرف اپنے لئے سمیٹ رکھی..... کبھی اپنی سوچوں میں کسی کو شریک نہ کیا کسی کا درد نہ سوچا..... کسی کا دکھ نہ سمجھا..... نظریں پیار کی تلاش کو بھٹکتی رہیں..... کسی کے اداس چہرے پر نہ پڑیں..... کسی کے غم نہ جان سکیں..... کسی کے آنسو نہ دیکھ سکیں..... کیا مجھ جیسے بخیل کو خیرات ملنی چاہیے.....؟ خدایا! میرا سر زمیں سے جا لگا.....! مجھے معاف کر دے خدایا..... میں نے بندوں سے فقط امیدیں ہی باندھی ہیں..... میں نے فقط ان سے طلب ہی کیا..... انہیں کچھ دیے بنا..... میں اٹھی..... ساری ہمتیں یکجا کیں..... قلب کو پھر سے ٹٹولا..... اور اپنی تھکن سے چور ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم بہت تھک گئی ہو..... چائے بنا دوں؟

اس کی عرصے کی تھکی ہوئی نظر اٹھی..... پیار و محبت کا پیغام لیے..... اس کے بند لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی..... زندگی بخش مسکراہٹ اور..... اور..... میرے دل کا کشکول یکا یک بھر گیا..... میری ساری پیاس بجھ گئی..... میری روح سرشار ہوگئی..... اور میں نے

محبتوں کا راز پالیا!!

(ہاسٹل فاطمہ جناح میڈیکل

کالج (لاہور) ۲۹ اپریل ۱۹۸۳)

☆☆☆

قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے!

یہ ایک بلاگ Driving My Saudi Princess in 2008 کی تلخیص ہے جسے بتول کے قارئین سے شیئر کر رہی ہوں، امید ہے کہ پسند آئے گا۔

''.....میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ میں اپنی اس شہزادی کے شاندار جیٹ میں بیٹھ کر ان کے ساتھ چلی جاؤں! میں ان سے کہے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ مجھے سوٹ کیس میں ڈال کر اپنے ہمراہ لے جائیں! جس پر انہوں نے جواب دیا کہ نہیں تمہیں وہ سب کچھ پسند نہیں آئے گا جو میرے ملک میں ہوتا ہے۔ تم اپنی ملازمت پر واپس جاؤ، میں تمہارے بچے کیلئے بھی پیسے بھجواؤں گی اور ہاں! جب وہ پیدا ہو تو مجھے اس کی تصویر ضرور بھیجنا.....'' جب ہم گلے ملے تو انہوں نے مجھے ایک لفافہ دیا جو میں نے گھر آ کر کھولا..... میں ائرپورٹ پر رو پڑی اور سوچنے لگی کہ اب نہ جانے کب شہزادی واپس آئیں گی؟ کتنا اچھا رویہ تھا ان کا میرے ساتھ یا کم از کم میرے منہ پر تو اچھا ہی تھا.....شہزادی کی نائب نے جب مجھے اپنا وہ ڈریس تحفے میں دیا جو مجھے پسند آیا تھا تو میں شدت جذبات سے مغلوب ہوگئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اسی خاندان کا ایک حصہ ہوں جن سے میرا تعلق چھ ہفتے پرانا تھا!

شہزادی کے دیے ہوئے لفافے میں 2000 ڈالرز تھے! میں نے ان پیسوں کے لئے بڑی محنت کی تھی۔ کمال مہربانی اور میزبانی کا ثبوت دیا تھا۔ اپنی، اپنے شہر اور ملک کی بہترین نمائندگی کی تھی۔ شدید برفانی موسم میں سڑکوں کی خراب صورت حال کے باوجود مکمل مہارت کے ساتھ آٹھ سے دس گھنٹے روزانہ ڈرائیونگ کرتی تھی اس حال میں جبکہ میں چار ماہ کی حاملہ تھی!!.....میں نے کیا!! یہ سب کچھ کیا.....''

معزز قارئین! یہ ایک بلاگ کا کچھ حصہ ہے جو یکم مارچ کو ایک ویب سائٹ Drop by drop we Fill the pot میں شائع ہوا۔ یہ ایک امریکی خاتون ٹیکسی ڈرائیور D.E.Cooper کی کہانی ہے جس نے 2008ء میں سعودیہ سے آنے والی ایک متمول (شاہی خاندان کی) خاتون کی چھ ہفتے تک خدمت کی تھی بطور ڈرائیور! یہ خاتون شہزادی نورا اپنے خاندان اور معاونین ملازماؤں کے ہمراہ امریکہ آئی ہوئی تھیں اور ڈرائیور کی طلب میں انہوں نے اس ایجنسی سے رابطہ کیا جو ڈرائیور

سپلائی کرتی تھی۔ یہ امریکی خاتون اس ایجنسی میں واحد خاتون ڈائیور تھی جو اس سعودی فیملی کو فراہم کر دی گئی۔

یہ خاتون اس شاہی خاندان سے بہت گھل مل گئی تھی خصوصاً ان کی ملازماؤں (نائبین) کے ساتھ! اس نے ان کی حرکات اور گفتگو کو بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ ان کی کمزور انگلش اور اپنی خراب عربی کی وجہ سے جو لطائف سرزد ہوئے ان کو اس بلاگ کا حصہ بنایا ہے۔ اگرچہ شہزادی بہت نفیس انگریزی بولتی تھیں مگر چونکہ واسطہ تو زیادہ تر نائبین کے ساتھ ہوتا تھا، جنہیں انگریزی پر عبور نہ تھا لہٰذا خوب خوب لطیفے ہوئے۔ زبان کا درست فہم نہ ہونے کے باعث مضحکہ خیز واقعات بھی ہوئے۔ زنانہ قسم کی بدحواسیاں، ایک دوسرے پر تبصرے، مشورے، نصیحتیں اس بلاگ کا حصہ ہیں۔

Cooper کا کہنا ہے کہ:

''.....اپنی ڈیوٹی کے دوران مجھے tip کے علاوہ دیگر مدات میں بھی کافی آمدنی ہوجاتی تھی۔ روزانہ 50 ڈالرز کی ٹپ شہزادی کی نائب کی طرف سے مجھے ملتی تھی کہ میں اپنے لئے برگر خرید لوں! ہم آپس میں مذاق کرتے کیونکہ ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی۔ ہم سب کو اچھی طرح علم تھا کہ ایک برگر محض ایک ڈالر میں باآسانی خریدا جا سکتا ہے مگر یہ لطف وکرم تھا..... وہ ہمیشہ ہنستی جب میں ڈالر menu کہتی۔

چھ ہفتے کی ڈھیروں کہانیاں ہیں جن سے میں اس دوران واقف ہوئی۔ بہت خوشگوار یادیں ہیں اور میں دوبارہ اس موقع کی منتظر! مجھے روزانہ سوڈالر ملا کرتے تھے اپنی خدمات کے صلے میں! Tips، تحائف اور کھانے اس کے علاوہ ہیں۔ یہ سب کچھ میری توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔ ڈرائیونگ کا یہ تجربہ میرے لئے بہت مثبت، دلچسپ اور معلوماتی رہا اور مالی آسودگی کا سبب بنا.....''

''شہزادی کی ایک نائب کو بہت افسوس تھا کہ وہ KFC نہیں کھا سکتی کیونکہ کچھ عرصے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی اور شہزادی نے اسے احتیاط کا مشورہ دیا ہے کہ اس قسم کے کھانے اس کو بدصورت کر دیں گے کیونکہ ان میں بہت روغن ہوتا ہے اور چہرے اور جلد کی شگفتگی کے لئے پرہیز لازمی ہے.....دوسری نائب نے ایک بچے کو جنم دیا جس کا نام خالد رکھا گیا وہ اسپتال میں آرام کر رہی تھی۔'' (یہ ساری تفصیلات اس امریکی خاتون کے احساس محرومی کا مظہر ہیں جو Don't care والے امریکی رویہ میں اسے نظر آتی ہیں)

وہ لکھتی ہے''.....شہزادی کی ایک رشتہ دار نے مجھے ایک گولڈن سکہ دیا جسے میں نے اپنے نیکلس میں لگوالیا۔ میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی مگر افسوس مجھے اسے کرایہ کی مد میں دینا پڑ گیا..... مجھے اس وقت تک علم نہیں تھا کہ سعودی عرب میں خواتین کو ڈرائیونگ کی اجازت نہیں ہے۔شہزادی سے ملاقات کے دو ہفتے بعد مجھے پتہ چلا تو میں حیران رہ گئی اور کہے بغیر نہ رہ سکی کہ میں بہت اچھی ڈرائیور ہوں کیونکہ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں وہ مجھے فارغ نہ کر دیں! انہوں نے مجھے تسلی دی کہ تم بہت اچھی ڈرائیور ہو! لیکن مجھے اپنے ملک میں کرنے کی اجازت مل بھی جائے تو میں شاید اسے پسند نہ کروں!! مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں کیا کہوں؟ اس ایجنسی میں میں واحد خاتون ڈرئیور تھی۔ میں نے کئی دفعہ سوچا کہ میں نے اس پیشے کا انتخاب کیوں کیا؟ مجھے اپنے اس سوال کا جواب نہ ملا بلکہ مزید سوالات بڑھتے چلے گئے.....''

''جس دن وہ لوگ روانہ ہوئے بڑا مصروف دن تھا اور جذباتی بھی!! اس کے بعد سے میں مستقل ان لوگوں کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں! شہزادی اور اس کے نائبین کے بارے میں ! وہ کیا کر رہی ہوں گی؟ کیسی ہوں گی؟ کیا وہ دوبارہ آئیں گی؟ کیا مجھے ان کی خدمت کا دوبارہ موقع مل سکے گا؟ کیا شہزادی کو اندازہ ہے کہ ان کی ڈرائیونگ کر کے میری زندگی کتنی تبدیل ہو گئی ہے؟ کیا انہیں معلوم ہو سکے گا کہ میں اپنے شہری حقوق کے لئے کس قدر محنت کر رہی ہوں؟''

''مجھے حیرانی ہے کہ شہزادی اور نائبین میرے بارے میں کبھی سوچتی ہوں گی کہ نہیں؟ مجھے یہ سوچنا اچھا لگتا ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی کھانے کی میز پر بیٹھی ہوں اور آپس میں میرے بارے میں گفتگو کریں، مجھے یاد کریں کہ وہ امریکی خاتون ڈرائیور جو سر پر سفید ٹوپی اوڑھتی ہے، کس قدر ذمہ داریوں اور مشکلات میں جکڑی ہوئی ہے!! شاید ان کو معلوم ہو کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟ جب 2010ء میں مجھے ملازمت سے برخواست کر دیا گیا یہ کہہ کر کہ میں ایک عورت ہوں!! مجھے امید ہے کہ وہ میرے بارے میں، میرے حقوق کے بارے میں بھی بات کریں.....''

''دو ہفتے پہلے مجھے منال الشریف سے ملنے کی سعادت ملی۔ یہ وہی خاتون ہے جس کی ڈرائیونگ کی ویڈیو ٹیپ نے پورے سعودی عرب میں تہلکہ مچا دیا

تھا۔منال سے ملنے کے بعد مجھے ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ کہنے کا موقع ملا کہ میں اظہار رائے کرسکوں! جی ہاں! اس بات پر کہ کسی خاتون کو ڈرائیونگ کی اجازت ملنی چاہیے یا سعودیوں کی طرح نہیں؟ منال سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ سعودی عرب خواتین اجازت حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت کررہی ہیں.....آپ زیادہ سے زیادہ اس بلاگ کو بڑھائیں تاکہ مستقبل کی خواتین زیادہ سے زیادہ مثبت انداز میں اپنے حقوق حاصل کرسکیں.....''

معزز قارئین! اس بلاگ کے آخر میں G.E.Cooper نے مدد کی درخواست کی ہے مالی اور اخلاقی! اس نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ خواتین کے ساتھ منفی امتیاز کے معاملے میں اتنا کام کرے کہ ایک کتاب لکھی جائے جس کا عنوان ہو Let My Mommy Drive! اس نے بخشش وغیرہ کے لئے ویب سائٹ کا ایڈریس(شاید اس میں اپنے بچے(بچوں؟)،ان کے باپ(شوہر؟)وغیرہ کی تفصیلات دی ہوں)اور منال کا ایڈریس بھی دیا ہے۔

اس بلاگ کو پڑھ کر بہت سے زاویوں سے بات ہوسکتی ہے طبقاتی فرق سے لے کر بنیادی حقوق تک! مگر جو بات مجھے کہنی ہے اور امید ہے کہ آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے،ایک عورت جو معاشی جدوجہد کے لئے ٹیکسی چلا رہی ہے اس کے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ کسی ملک میں اس پر اس کی پابندی ہے تو وہ حیران ہوجاتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ عورت کا معاشی جدوجہد سے بری الذمہ ہونا اور خاندانی نظام کے خوبصورت جلوے اسے خیرہ کردیتے ہیں بمقابلہ اپنی خودمختاری اور آزادی کے!! اس بلاگ کو سعودی عرب میں خواتین کے حقوق کے ایشو کے لئے استعمال کیا گیا ہے جبکہ اس کا ہر لفظ امریکی،مغربی عورت کی لاچاری اور بے کسی ظاہر کررہا ہے۔بظاہر ہر دو جگہوں پر خواتین کے خودمختار ہونے کی تمنا کی گئی ہے مگر اس کے زیرلب جھلکتی آزاد عورت کی مظلومیت مسلم عورت کو بہت تفاخر کا احساس دے رہی ہے۔خوبصورت خاندانی نظام کے تحت زندگی گزارنے والی خواتین اس نعمت کا احساس کریں ذرا!!

اس بلاگ کو پڑھ کر میں نے تبصرہ لکھا کہ ''یہ اتنا بڑا ایشو نہیں ہے! امریکی خاتون زیادہ مصائب کا شکار نظر آتی ہے جسے پیسے کمانے کے لئے Odd job کرنی پڑ رہی ہے جس سے سعودی خواتین مبرا ہیں۔عورت کی

فطرت میں ہے کہ وہ گھر کو سجائے اور بچے کو پالے اور اس سے یہ حق چھین کر اسے ڈرائیونگ پر لگا دینا اس کی نسائیت کو کچل دیتا ہے۔ بہتر ہے کہ خواتین کو حقوق دلانے کے لئے اسے باوقار درجہ دیا جائے بجائے اس کے کہ وہ معمولی نوکریوں کی بھیک مانگتی رہے.....''

اس کے جواب میں Cooper نے جو جملے لکھے وہ ہی میرے اس بلاگ کا محرک بنا.....'' آپ کا تبصرہ ہو بہو وہی بات کہہ رہا ہے جس کے لئے میں اپنی سچی کہانی دنیا کے سامنے لائی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپنے تکلیف دہ خیال کو دنیا کے ساتھ شیئر کیا! ہوسکتا ہے کہ آپ کے جملے پڑھ کر ہر ایک کو احساس ہوجائے کہ یہ اتنا بڑا ایشو کیوں ہے؟ شکریہ.....''

دیکھا آپ نے! ذومعنی جملے کے باوجود اس معاملے کی اہمیت اجاگر ہورہی ہے کہ کیوں آخر عورت کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا گیا ہے؟ یہ بڑا symbolic رویہ ہے عورت کو معاش کا پہیہ بنانا جبکہ خدائی قانون میں یہ مرد کی ذمہ داری ہے!! آیئے قطرہ قطرہ حقوق جمع کرتی عورت کو اسلام کے مصفا چشمہ سے سیراب ہونے کی طرف متوجہ کریں!!

☆☆☆

آسیہ راشد

ہر دلعزیز بنیے

انسانوں کے میل ملاپ سے ہی معاشرہ بنتا ہے انسان ہی اسے بہتر بنا سکتے ہیں اور وہی اسکے بگاڑ کا سبب بھی بنتے ہیں اگر ہر شخص آخرت کی جوابدہی کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام معاملات میں اپنے آپ کو افضل بنانے کی کوشش کرے تو بہترین معاشرے کی تشکیل کو کوئی نہیں روک سکتا۔

دوسروں سے محبت کرنا اور ان کے لئے مرکز محبت بننا انتہائی خوش نصیبی ہے۔ مقدر والے لوگوں کو ان کے دوست احباب عزیز رکھتے ہیں۔ دوسری جانب وہ شخص انتہائی محروم ہے جسے لوگ ناپسند کرتے ہیں مگر اس کے رعب و دبدبے اور خوف کی وجہ سے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ چیز شامل ہوتی ہے کہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ چند باتوں پر عمل کر کے اسے بہت بڑا فائدہ حاصل ہو جائے گا تو وہ اپنی تمام تر توانائیاں ان کے حصول کے لئے لگا دے گا۔ اسی طرح ہر دلعزیز بننے کے چند گُر ہیں جو ہم آپ کو بتاتے ہیں مگر اخلاص شرط ہے۔ نیت خالص اللہ کے لئے ہو تو کامیابیاں ہی کامیابیاں ہیں۔

آپس میں میل جول بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ملتے وقت سب سے پہلے ایک دوسرے کو سلام کریں۔ سلام اتنی اونچی آواز میں ہونا چاہیے کہ دوسرا بہ آسانی سن لے۔ یہ سلامتی کی دعا ہے اور دوسرا بھی جواب میں وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کہے۔ ہمیشہ سلام کرنے میں پہل کریں اور سبقت لے جانے کی کوشش کریں کیونکہ پہل کرنے کا ثواب زیادہ ہے اور اس میں ہمارا اپنا فائدہ ہے۔ سلام کہنے کے ساتھ مصافحہ بھی ضرور کریں کیونکہ جب مومن ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں تو ان پر سو درجے رحمت نازل ہوتی ہے۔ ہاتھوں سے محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور باہمی محبت میں اظہار بہت ضروری چیز ہے۔

رسولؐ نے فرمایا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا بھی صدقہ ہے (ترمذی)

آپؐ نے فرمایا میں تمہیں اس آدمی کی پہچان بتاتا ہوں جس پر جہنم کی آگ حرام ہے اور وہ آگ پر حرام ہے۔ یہ وہ آدمی ہے جو نرم مزاج ہو، نرم طبیعت ہو اور نرم خو بھی ہو (ترمذی)

دوسروں سے ملاقات کے وقت سنت رسولؐ کی اتباع

کریں۔صحابہؓ فرماتے تھے نبی کریمؐ جب ملاقات کے وقت کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو اپنے پورے جسم کے ساتھ متوجہ ہوتے اور جب کوئی آپؐ سے بات کرتا تو آپؐ پوری طرح متوجہ ہوکر اس کی بات سنتے۔

جب ملاقات کیلئے کسی کے گھر جائیں تو کبھی کبھار کوئی تحفہ جیسے پھل، کیک، مٹھائی، بسکٹ وغیرہ یا موقع کی مناسبت سے کچھ لے جائیں اگر کسی غریب عزیز یا ملنے والے کے ہاں جانا ہو تو اس کی ضرورت کی اشیا کا تحفہ جیسے چاول، چینی، گھی وغیرہ کا تحفہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

ہماری زندگی خوشی وغم سے عبارت ہے۔ خوشی کے موقع پر اگر کسی عزیز کے ہاں جانا نہ ہوسکا تو کوئی بات نہیں مگر دکھ کے موقع پر پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اگر کسی کا عزیز فوت ہوگیا ہے تو اس کے گھر جائیں جنازے میں (مرد وحضرات کو) شرکت کا باقاعدہ حکم دیا گیا ہے۔ اگر آپ کسی اور شہر میں ہیں جہاں سے آنا ممکن نہیں تو کم از کم فون پر تعزیتی کلمات کہہ لینے میں کوئی حرج نہیں اس سے دل شکستہ فرد کو ڈھارس ملتی ہے کہ اس دکھ اور غم کے موقع پر ہمارے قریبی عزیز یا دوست نے ہمیں یاد رکھا اور ہمارے درد کو محسوس کیا۔

آج کے دور میں اگر کوئی عزیز یا دوست ملنے گھر آ جائے تو گھر والے سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ضرور اس کا اپنا کوئی فائدہ ہوگا یا اس کو ان سے کوئی کام ہوگا جو بعد میں پتا چلے گا اور باتوں باتوں میں کھوج لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ایک شخص آج کی مصروفیت کے دور میں اپنا وقت، پٹرول، پیسہ خرچ کر کے صرف آپ کی محبت میں اور اللہ کو خوش کرنے کے لئے آیا ہو، اگر ہم کسی عزیز کو اسکی خوشی کے موقع پر مبارکباد دینے اس کے گھر جاتے ہیں اور ساتھ کچھ تحفے تحائف لے کر جاتے ہیں اور وہ عزیز گھر پر موجود نہیں ملتا، ہم تحائف اس کے گھر چھوڑ آتے ہیں، یا اپنے گھر سے کسی کے ذریعے کوئی تحفہ بھجواتے ہیں تو اس عزیز کا فرض ہے کہ وہ تحائف ملتے ہی فون کرے اور آنے والے کا شکریہ ادا کرے۔ مگر لوگ عموماً ایسا نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا فرض تھا جو اس نے پورا کیا۔

عید بقرعید پر اپنے دوست احباب، رشتہ داروں ہمسایوں سے ضرور ملیں۔ اگر وقت کی کمی ہو یا کوئی گھریلو مجبوری ہو تو کم از کم فون پر ضرور عید مبارک کہہ دیں۔

اگر کوئی آپ کو فون کرے اور آپ گھر پر موجود نہ ہوں جب آپ کو پیغام ملے تو فوراً کال بیک کریں یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے۔

اگر کوئی دعوت پر بلائے تو اسے قبول کریں۔

کھانے کے بعد گھر والوں کی میزبانی کا شکریہ ادا کریں ان کے کھانے کی تعریف کریں بلکہ اگلے روز فون کر کے دوبارہ میزبان کا شکریہ ادا کریں۔

مہمانوں کے آنے پر برا نہ منائیں بلکہ خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہیں۔ حسبِ توفیق آنے والوں کی خاطر تواضع کریں کہ ملنے والے آپ سے مل کر دلی مسرت اور اطمینان محسوس کریں۔ دوسروں کے برے رویوں سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ بلکہ احسان کا رویہ اختیار کریں۔ احسان کرنے والے اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہوتے ہیں۔

بیماری میں ایک دوسرے کے کام آئیں کسی بھی وقت ہمیں بھی دوسروں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

استعمال کی چیزیں ایک دوسرے کو دینے میں کوئی حرج نہیں۔ آج کل تو ایسا ہے کہ اگر گھر کے ایک فرد کی استعمال کی چیز خراب ہوگئی ہے وہ دوسرے سے مانگ لے تو اسے ٹکا سا جواب مل جاتا ہے بلکہ نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ چیز ہے تو سہی مگر آپ کو نہیں دینی کیونکہ ہم آپ کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کیلئے تباہی کی وعید ہے۔

کسی کھانے کی ترکیب چھپا لینا، اگر کسی کو بتانا تو آدھی ترکیب بتانا تاکہ اسکی بنائی ہوئی چیز اچھی نہ بن جائے۔ سوئیٹر کا نمونہ، کپڑوں کے ڈیزائن چھپانا عام سی بات ہے۔ اگر کسی کو علم ہو کہ کسی کی درست سمت میں رہنمائی کرنا انتہائی نیکی کا کام ہے تو کبھی بھی کوئی پس وپیش سے کام نہ لے۔

اگر کسی بات پر اختلاف ہو تو فوراً صلح صفائی کر لیں اور ہمیشہ معافی طلب کرنے اور قصور کا اعتراف کرنے میں پہل کریں تین دن سے زیادہ ناراضگی رکھنا گناہ ہے۔

اپنے آپ کو عقل کل سمجھنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے اپنے آپ کو بڑا اور دوسرے کو حقیر جانتے ہوئے یہ سوچ لینا چاہیے کہ نہ یہ صورت میری، نہ علم میرا، نہ زبان میری، نہ قلم میرا نہ پیسہ میرا، نہ عہدہ وجاہ وجلال میرا۔ اگر یہ سب مجھے دیا گیا ہے تو میرے رب کی توفیق ہے جس میں میرا کوئی بھی کمال نہیں اور جسے میں حقیر سمجھ رہا ہوں، جس کی صورت مجھے اچھی نہیں لگتی وہ اس لئے حقیر ہے کہ وہ میرے Status کے دائرے میں نہیں آتا تو یہ سب کچھ تکبر کے دائرے میں آجاتا ہے اور تکبر کو تو گناہ کبیرہ اور شرک بھی کہا گیا ہے۔

زندگی کو مثبت انداز میں گزارنے کی کوشش کریں ہر ملنے

والے کی خوبیوں پر نگاہ رکھیں خامیوں سے درگزر کریں تو زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔

دوسروں کے بارے میں اچھا گمان رکھیں۔ بدگمانی بہت سے دلوں کی دوریوں کو بڑھاتی ہے۔نمائشی عاجزی دکھانا،الفاظ میں اپنے آپ کو حقیر کہنا،رفتار اور انداز میں خشوع کا اظہار کرنا،نہایت آسان ہے لیکن اپنے نفس پر چوٹ سہنا بہت مشکل ہے۔اپنے نفس کے خلاف دوستوں کی تنقیدیں برداشت کرنا انتہائی مشکل ہے۔بہترین دوست وہ ہیں جو ایک دوسرے کی تربیت اور اصلاح کرتے ہوئے تکبر اور خود پسندی سے دوسروں کو بچاتے رہیں۔

مسلم کی ایک حدیث ہے"ایک آدمی نے کہا'اے اللہ کے رسولؐ میرے رشتہ دار ہیں میں ان سے جڑتا ہوں لیکن وہ کٹے رہتے ہیں۔ میں ان سے اچھا سلوک کرتا ہوں لیکن وہ مجھ سے برا سلوک کرتے ہیں۔میں ان کی بات پر صبر کرتا ہوں لیکن وہ مجھ سے جہالت سے پیش آتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔اگر ایسا ہی ہے تو تو گویا تو ان کے منہ پر راکھ چھڑکتا ہے۔اور جب تک تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتا رہے گا اللہ کی طرف سے ایک مددگار ان کے مقابلے کیلئے تجھے دے دیا جائے گا یعنی تو ان پر غالب رہے گا۔"

اس شخص کی خوش قسمتی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جسے اللہ کی طرف سے مددگار ملا ہو۔

آیئے ہم سب اپنا جائزہ لیں کہ ہماری زندگیوں میں کہاں اور کیا کمی ہے اور اسے دور کرنے کی منصوبہ بندی کریں۔

☆☆☆

یہ بے حسی!

قراۃ العین مریم۔کراچی

جیسے ہی ٹی وی اسکرین پر ہڑتال کی خبر آئی سارے بچوں نے ایک ساتھ ہی ''یاہو'' کا نعرہ لگایا اور سب ہی اگلے دن کی ہونے والی چھٹی پر کرنے کے کام گننے لگے۔کسی نے ٹی وی پر یہ دیکھنا گوارا تک نہ کیا کہ ہڑتال کی وجہ کیا ہے۔ ہڑتال ہونی تھی سانحہ کوئٹہ کی وجہ سے.....وہ سانحہ کوئٹہ جس میں متعدد لوگوں کی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں لوگ سڑکوں پر روتے بلبلاتے اپنے پیاروں کو ڈھونڈتے رہے جہاں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ایمبولینسوں کا شور،عورتوں اور بچوں کی چیخیں،بوڑھوں کی آہ وزاری کرتی آوازیں اور زخموں سے چور کراہتے ہوئے لوگ تھے ڈھونڈنے والوں کے لیے سخت امتحان تھا کہ وہ اپنے پیاروں کو کہاں ڈھونڈیں؟ زندہ زخمیوں میں یا مردہ لاشوں میں یا لوگوں کی بھیڑ میں؟

کوئٹہ کے حالات دن بہ دن بدتر ہوتے جارہے ہیں مگر کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا کراچی میں روز لوگ موت کے گھاٹ اتارے جارہے ہیں مگر لوگ بے حس ہوگئے ہیں۔مشینوں کی طرح.....سب اپنے معمول کے مطابق صبح گھر سے نکلتے ہیں اور شام کو واپس آجاتے ہیں اور جو نہیں لوٹتے ان کے لیے تھوڑے دن رو کر سوگ منایا جاتا ہے اور زندگی واپس معمول پر آجاتی ہے۔فرق پڑتا ہے تو صرف میت کے گھر والوں کو اس کے بچوں کو اس کی بیوی کو اس کے بوڑھے ماں باپ کو اور بہن بھائیوں کو،وہ روتے رہتے ہیں بددعائیں دیتے رہتے ہیں مگر کوئی ان قاتلوں کو نہیں پکڑتا اگر کوئی سیاسی فرد مرتا ہے تو ہڑتال ہو جاتی ہے اور پھر بھی عوام کا ہی نقصان کیا جاتا ہے توڑ پھوڑ ہوتی ہے اسکول بند ہو جاتے ہیں۔ہفتے میں دو دن تو معمول کے مطابق سرکاری چھٹی ہوتی ہے تین دن ہڑتال اور حالات کی خرابی کے باعث بند کرنا پڑتے ہیں اور باقی دو دن جو بچے اسکول کی نذر کرتے ہیں تو ان میں سے ایک دن ٹیچر کا دل نہیں چاہتا پڑھانے کو اور دوسرے دن بچوں کا موڈ نہیں بنتا پڑھنے کو..... ایسے ماحول کو کون سدھار سکتا ہے؟ نہ حکومت کو پروا ہے نہ عوام کو۔ اگر پاکستان کے عوام نے ایک صحیح سمت متعین کی ہوتی تو آج ملک کا یہ حال نہ ہوتا۔ ☆

ایک احساس

ستارہ منصور۔لاہور

پیاری آپی جان!

رات آپ سے بات کرنے کے بعد آپ کی صحت کے حوالے سے تھوڑی پریشانی ہوئی اتنا عرصہ بھرپور توانائیوں کے ساتھ کام کرتا دیکھ کر آپ کی آواز میں ہلکی نقاہت اور کمزوری فکرمند کر دیتی ہے۔

آپ کی ذمہ داریوں میں معمولی سا ہاتھ بٹا کر جو خوشی اور طمانیت مجھے ہوتی ہے وہ میرے لیے کسی ٹانک سے کم نہیں ہوتی۔

سوچتی ہوں کاش وقت ایک جھولے کی مانند ہوتا! ہم جھولا لینے کے لیے پوری طاقت لگا کر تیز ہوا کی خوش کن لپٹوں کے ساتھ اسے آگے بڑھاتے ہیں تو ایک خاص بلندی پر جا کر رک جاتے ہیں۔ جھولا آگے نہیں جاتا۔ پھر یہی عمل بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اور ہم ان پرسکون اور خوشی کے لمحوں سے ہر بار پہلے سے بھی زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں مگر زندگی اس سے مختلف ہے۔

وقت کو اپنے پروں پر کتنا بھروسا اور ناز ہوتا ہے کہ دیوانہ وار بڑھتا چلا جاتا ہے پھر لوٹ کر نہیں آتا ہم سب ہی حسب توفیق و استطاعت کبھی بھاگتے کبھی دوڑتے، کبھی گھسٹتے اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ کی صحت کے لیے جو دعا کرتی ہوں وہ لفظوں کی ادائیگی کے قید و بند سے چھٹ کر دل کی گہرائیوں میں نیچے کی جانب اترتی چلی جاتی ہے پھر دل کے مرکز میں جا کر ٹھک جاتی ہے پھر وہاں سے اس کا اخراج ہوتا ہے جس کو coedheat کہتے ہیں۔ ہمیشہ سے آپ کی بہترین صحت کی دعا گو۔ آپ کی خصوصی دعاؤں کی طالب۔ ایک پردیسی کی مسافر بیوی۔ ☆

مالی داکم.....

روبینہ عاطف

''بھئی ایک تو بے موسم کی بارشوں نے ویسے ہی خنکی کر دی ہے اس پر آپ کی ٹھنڈی آہوں نے کمرہ کا درجہ حرارت صفر پر پہنچا دیا ہے۔''

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بابا جان نے میری سرد آہ پر جھرجھری لینے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ ان کی اس ادا سے باوجود غصے کے میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''بابا جان آپ تو صرف سرد آہوں سے گھبرا گئے یہاں تو گرج چمک کے ساتھ بارش بھی ہو چکی۔'' معز نے خود کو پڑنے والی ڈانٹ اور میرے رونے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا! وہ کیوں بھلا؟'' بابا جان نے پوچھا۔

''کوئی نئی بات نہیں۔'' میں بولی۔ ''وہی پرانے قصے

ہیں ان لڑکوں پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔''

''میرے دوست کا SMS آیا ہے میں تو چلا۔''معز نے اپنے موبائل پر دیکھتے ہوئے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔

''ہاں بھئی اب بتاؤ ہوا کیا؟''بابا جان نے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے، میں تو تنگ آ گئی ہوں ان لڑکوں سے کمپیوٹر سے اٹھتے ہیں تو موبائل۔موبائل سے جان چھوٹے تو کمپیوٹر.....آگ لگے ایسی ٹیکنالوجی کو نہ دین کا ہوش نہ دنیا کی خبر۔کچھ سمجھاؤ تو آگے سے ایسی تاویلیں دیں گے کہ دل جل جاتا ہے۔میں تو تھک گئی ہوں۔میں نے تو انھیں سدھارنے کی کوشش ہی چھوڑ دی ہے۔''

''نہ نہ ایسا نہیں کہتے۔کوشش شرط ہے۔''

''رہنے دیجیے بابا جان میں تو ساری کوششیں کر کے ہار گئی اب مجھ میں ہمت نہیں۔''

میں پھر رونے کو تھی کہ انھوں نے موضوع ہی بدل دیا۔''اچھا یہ بتاؤ یہ کیا کر رہی ہو؟''

میں بڑے جوش سے چاندی کے ایک نقیشن گلدان کو چمکانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

''یہ گلدان میری شادی پر خالہ جان نے تحفے میں دیے تھے۔پچھلے ہفتے جب وہ آئیں تو اچانک انھیں یہ یاد آئے مجھ سے ان کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔میں تو انھیں سٹور میں رکھ کر بھول چکی تھی۔پرسوں گرمی میں اوپر جا کر سٹور میں گھنٹہ بھر لگا کر میں نے مشکل سے تلاش کیے۔ دیکھا تو گرد سے بھرے ہوئے تھے۔مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ خالہ جان کیا سوچیں گی کہ ان کے دیے ہوئے قیمتی تحفے کا میں نے کیا حال کر دیا ہے۔سو پرسوں سے ان کے ساتھ کھپ رہی ہوں۔''

''اچھا!وہ کیسے؟''

''پہلے تو مشکل سے سٹور سے تلاش کر کے نکالا پھر کپڑے سے ساری گرد صاف کی۔لیکن گردان کے نقش و نگار میں پھنس گئی تھی۔ایک پرانا ٹوتھ برش لے کر دو گھنٹے لگا کر اسے صاف کیا پھر سرف اور جالی سے دھویا کچھ خاص فرق نہ لگا تو وم اور سکاچ برائٹ سے مانجھا لیکن تسلی نہ ہوئی۔پھر ایک سہیلی نے مشورہ دیا کہ بازار سے کیمیکل ملتا ہے وہ لگا کر صاف کرو چمک اٹھیں گے۔سو صبح بازار گئی۔دو گھنٹے لگا کر یہ کیمیکل ملا تو اس کی ہدایت کے مطابق دھو کر کیمیکل لگا کر رکھ دیا اب کھردرے کپڑے سے رگڑا ہے تو چمک اٹھے ہیں۔''میں نے ساری روداد بیان کی۔

''ان سارے کاموں سے تم تھکی نہیں؟''وہ بولے۔

''تھک تو گئی لیکن اب یہ چمک اٹھے ہیں تو ساری

تھکن دور ہوگئی۔''

''اور اس ساری کوشش کا فائدہ کیا ہوا'' انھوں نے پوچھا۔

''خالہ جان دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی اور میں ان کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ جاؤں گی۔''

ماشاءاللہ! ایک بندے کو خوش کرنے اور اس کے دیے تحفے کو چمکانے کے لیے تم نے اتنی کوششیں کیں اور تھکاوٹ سے گھبرائی بھی نہیں۔ جانتی ہو اولاد اللہ تعالیٰ کا قیمتی تحفہ ہے قیامت کے دن جب وہ اس تحفے کے بارے میں پوچھے گا تو کیا کہو گی؟ تھک گئی تھی تو کوشش ترک کر دی تھی؟''

بابا جان کی بات سن کر میں گنگ ہوگئی۔ ''میری جان! ہمت حوصلے سے اولاد کی بہترین تربیت کی کوشش جاری رکھو کل کو جب تمھاری کوششوں سے یہ اچھے مسلمان بن کر معاشرے میں اپنا کردار ادا کریں گے تو تمھاری ساری تھکن دور ہو جائے گی اور سب سے بڑھ کر تمھارا رب تم سے راضی ہو جائے گا۔ اصل میں ہمارا مسئلہ جانتی ہو کیا ہے؟''

''جی کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم ''انا'' یعنی ''میں'' کے چکر میں ہیں۔ میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا، مجھے یہ نتیجہ چاہیے۔ ''انا'' کے چکر سے نکلو اپنے رب کو خوش کرنے کے لیے اولاد کی بہترین تربیت کی کوشش کرو نتیجہ اس کی ذات پر چھوڑ دو۔ دیکھو شاعر نے اپنے عارفانہ کلام میں اس بات کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے ۔

مالی دا کم پانی دینا بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھل لانا لاوے یا نہ لاوے

نم آنکھوں کے ساتھ میں نے تشکر سے بابا جان کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔☆

جیسی مائیں ویسی قوم

شہناز یونس۔ لاہور

Give me good mothers I'll give you a good nation.

محترمہ اب یہ مقولہ غلط ہو گیا ہے۔

فِزا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جی؟ ندا نے فوراً کہا، کبھی بڑے لوگوں کے مقولے بھی غلط ہوتے ہیں؟

فِزا اگر آج نپولین بوناپارٹ پاکستان میں آجائے تو پنجاب اسمبلی کی خواتین صوبائی ممبران کو دیکھ کر اپنا سر بھی پیٹ لے اور فوراً مقولہ تبدیل کر کے یہ کہہ دے کہ '' Give me Commando mothers I'll give

''you a nation of wild animals and vultures.

اُف خدایا! ندا نے کہا آج پھر پنجاب اسمبلی میں بدتمیزی ہوئی ہے؟

بدتمیزی نہیں بدتہذیبی بھی! وہ اسے ٹی وی لاؤنج میں لے آئی جہاں پنجاب اسمبلی کا اجلاس دکھایا جارہا تھا۔ان دونوں کے والدین پہلے ہی وہاں پریشان بیٹھے یہ صورتحال ملاحظہ کررہے تھے۔خواتین تو ماشاء اللہ ساری کی ساری صحت مند تھیں کچھ زیادہ ہی صحت مند تھیں جن کا جثہ ان کی حالت بتارہا تھا میک اپ زدہ چہرے لمبے لمبے ناخنوں سے مزین ہاتھ مشہور سیاسی پارٹیوں کی خواتین آپس میں دست وگریباں ..... دوخواتین کے دوپٹے گر گئے وہ ان کے اسمبلی برادران نے اٹھا کران کو دینے کی کوشش کی تو ان کو بھی دھکے پڑ گئے۔

ماں نے کہا بیٹا چینل تبدیل کردو۔دونوں بیٹیوں نے جواب دیا امی ہم چینل تبدیل کردیں گے مگر یہ پوری دنیا میں دیکھا جارہا ہے۔آپ دنیا کی آنکھیں تو بند نہیں کرسکتیں ویسے بھی ہمیں پورا اجلاس دیکھنے دیں ہمارے کالج میں چند روز بعد ایک تقریب ہے جس میں ایک ممبر صوبائی اسمبلی نے آنا ہے ان کے تو ہم خوب لتے لیں گے۔

والدین یہ صورتحال دیکھ کر سخت پریشان کہ ان کے گھر والے جب یہ سب کچھ ٹی وی پر دیکھ رہے ہوں گے تو کس قدر شرم سے ڈوب ڈوب جارہے ہوں گے۔جن بچوں کی مائیں یہ کررہی ہیں وہ اپنے سکول کالج میں کیا منہ لے کر جائیں گے۔ یہ جن کی بیٹیاں،بہنیں ، یا بیویاں ہیں وہ کس قدر شرمندہ ہونگے۔

فِزا ایک دم بولی،امی نہ تو کوئی شرمسار ہوگا اور نہ کوئی ندامت محسوس کررہا ہوگا۔اگر یہ لوگ اتنے ہی شرم والے ہوتے تو دن رات جو شرم وحیا کا جنازہ ٹی وی پر نکلتا ہے وہ ہی ختم کروانے کی کوشش کرتے بلکہ یہ جو مار کٹائی ہورہی ہے ان کے گھر والے تو دیکھ کر شاید یہ کہہ رہے ہوں گے کہ شاباش امی! یہ آنٹی آپ کے سامنے ہیں ان کو تو زبردست جوڈو کا ایک ایکشن کروائیں اور ہاں اوہو آپی! یہ جو آپ کے بائیں جانب ہیں نا ان کو آپ leg lock لگا کر زمین پر گرادیں اور ہاں جس کی بیٹی ہیں وہ والد محترم فرمارہے ہوں گے ارے بیٹا! تم سامنے کھڑی خاتون کو neck lock کیوں نہیں لگارہیں،حد ہوگئی ہے!

ندااورفزا کے والد نے کہا بیٹا یہ کوئی مذاق کی بات نہیں یہ تو قوموں کی زندگی میں ایک بہت بڑا دھبہ ہے

ندابولی ابو! کونسی قوم؟ آپ اس ملک کے لوگوں کو قوم کہہ رہے ہیں قوم تو یہ بن ہی نہ سکی۔ یہ جو اسمبلی میں مخلوق ہے یہ اس قابل ہے کہ اس کی گود میں قوم کے جوان پروان چڑھ سکیں؟ آپ قومی اسمبلی میں بیٹھی فل میک اپ زدہ چہروں اور بے انتہا قیمتی نت نئے لباسوں میں ملبوس ممبران کو دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان عورتوں نے کبھی اپنے بچوں اور گھروں کو وقت بھی دیا ہوگا؟ اپنے اپنے حلقے کے لوگوں، خواتین اور بچوں کی کیا تربیت کرتی ہونگی جو خود تعلیم و تربیت سے بے بہرہ ہوں؟ ویسے بھی کوئی پتہ نہیں کہ اصلی ڈگری بھی کسی کے پاس ہے یا سب جعلی ڈگری یافتہ ہیں۔ یوں تو تمام صوبائی اسمبلیوں کا ہی برا حال ہے مگر پنجاب نے بڑا ہونے کے ناطے اپنا کردار نبھایا۔ شاباش پنجاب اسمبلی کی خواتین ممبران Bravo!

وہ دونوں بولتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں اور ان کے والد سر جھکائے یہ سوچتے رہے کہ چھیاسٹھ برسوں میں ہم نے قوم کے درست نمائندے چننے کا ہنر نہیں سیکھا تو ہمارے حالات کیسے بدل سکتے ہیں؟ ہم شکوہ کریں بھی تو کس سے؟ ☆

محشرِ خیال

رفعت اشتیاق۔گوجرہ

انہونی کبھی کبھی ہوا کرتی ہے۔ ابھی مارچ کے بتول پر تبصرہ لکھ رہی تھی کہ پانچ تاریخ کو اپریل کا بتول مل گیا۔قانتہ رابعہ کا سفر سعادت تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا پڑھتے ہوئے اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ طوافِ زیارہ پڑھ کر دل کو کچھ ہونے لگا کہ اب کہیں واپسی نہ ہو۔سوچتی ہوں کہ حج کے دوران کتنے لوگ ہوں گے جنھوں نے قانتہ رابعہ کی طرح یہ دولت سمیٹ کر ہماری جھولی میں ڈال دی۔ جزاک اللہ ہم سب کو اللہ تعالیٰ صدقہ جاریہ بنائے قانتہ رابعہ کے لیے۔ایک جگہ لکھتی ہیں۔

''دور سے مطاف پر نظر ڈالیں تو لگتا ہے پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔جوں جوں قریب جائیں آپ کو نسبتاً کم رش محسوس ہوگا اور مطاف کے اندر جانے پر تو کچھ نہ کچھ خالی جگہ مل ہی جاتی ہے۔ بہرحال میں نے جونہی بیت اللہ پر نظر ڈالی ، دیوانے مستانے ارد گرد پروانوں کی طرح گھومتے نظر آئے۔ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے غڑاپ سے اندر چلی گئی۔اللہ مالک ہے۔''

حسب سابق صائمہ اسماء صاحبہ کا اداریہ سیاسی حالات کا نچوڑ تھا۔ایک خبر جو نہایت ہی غمگین کر گئی کہ پنجاب حکومت نے فروری میں دسویں جماعت کی اردو لازمی کے نئے ایڈیشن میں سے اسلامی اور نظریاتی تحریریں نکال دی ہیں۔

''خانہ بدوشوں کا ڈیرا'' بنت الاسلام کی تحریر ایک مومنہ کی فراست کا منہ بولتا ثبوت ہے۔لکھتی ہیں۔

''جس طرح تم خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں گئی ہو نا اسی طرح خدا کے فرشتے ہمارے ڈیرے میں آیا کرتے ہیں تم خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی غلاظتوں کو دیکھ کر اس قدر گھبرائیں کہ پندرہ منٹ بھی وہاں گزارنے مشکل ہو گئے۔خیال کرو کہ جب یہ پاک مخلوق ہمارے ڈیرے کی غلاظتیں دیکھتی ہوگی تو کیسی کچھ نہ گھبراتی ہو گی۔''

'بھنور کی آنکھ' میں قانتہ رابعہ نے ہستی کی اوقات بتا دی۔انسان ہمیشہ دوسروں کو درست کرنے

میں لگا رہتا ہے لیکن اپنی فکر نہیں کرتا۔ یہی بات جس کی طرف ڈاکٹر بشریٰ تسنیم صاحبہ بھی بڑے مستحسن طریق سے اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہیں ''دوسرے کے بارے میں جو خیالات ہیں اس آئینے میں اپنی شکل نظر نہیں آتی۔ نصیحت کی ضرورت دوسروں کو ہے۔ لوگ ایماندار ہو جائیں۔ لوگ صابر و شاکر ہو جائیں، لوگ خدا خوفی اختیار کریں، اپنا آپ پہچان لیں۔ دوسرے اپنا احتساب کرلیں۔ لوگ خود کو بدل لیں جب بھی یہ کوئی بولتا ہے خود کو اونچے سٹیج پر کھڑا کر لیتا ہے۔ سامنے عوام الناس کے حصے میں ''کر لینا چاہیے، ہو جانا چاہیے، کرلیا جائے، ہو جائیں'' کی تکرار آتی ہے۔''

''نعت رسول مقبولؐ'' شاہدہ سحر کا عشق رسولؐ مصطفیٰ میں ڈوبا ہوا کلام ماشاءاللہ۔ نجمہ یاسمین یوسف صاحبہ اور شمیم فاطمہ صاحبہ ہر دفعہ ایک نئی غزل کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں لیکن ہائے ہماری کوتاہی تعریف کیے بنا ہی تبصرہ مکمل کر دیا۔ اگر ہم لکھ نہیں سکتے تعریف تو کر سکتے ہیں۔ نجمہ صاحبہ لکھتی ہیں۔

تو نے ٹھہرا کے میرے دل کو محبت کا
سفیر
باعثِ ناز کیا صاحبِ توقیر کیا

دیدۂ غم تو فقط درد کو نذرانہ ہے
کون کہتا ہے کہ غم نے ہمیں دلگیر کیا

شمیم فاطمہ صاحبہ یوں گویا ہوئیں:

غم کی آنچ جلا دیتی ہے ان کے بال و
پر
رہ جاتے جو پروانے بابِ حرم سے دور

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرم کی قربت نصیب فرمائے آمین۔ اس دفعہ لگتا ہے افسانوں پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک اور بتول مرتب کرنا پڑے گا۔ کہیں چاند راہوں میں کھو گیا، نصرت یوسف صاحبہ مثبت اور منفی کردار کو عیاں کرتے ہوئے نعمتوں کا شکر اور ناشکری کا فرق واضح کرتی ہیں اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانے کا اہتمام کس خوبصورتی سے کر رہی ہیں۔ ربیعہ ندرت کا ''ارمان''، عالیہ حمید کا ''چراغ'' اور ''دلِ ناداں'' طوبیٰ احسن کا شاہکار افسانہ حساس دلوں کے تار ہلانے کا سامان کر گئے۔ ما شاء اللہ۔ اسی بات پر عبدالمجید صاحب کا وہ تبصرہ دل کو طمانیت بخش گیا۔ اس اضافے کے ساتھ کہ اللہ اس کو آپ (مدیرہ) کے لیے اور تمام لکھنے والوں کے لیے صدقہ جاریہ بنائے آمین۔ حمیرا ثاقب صاحبہ بتول میں آپ کی واپسی پر خوش

آمدید۔ہم سب بہنیں آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو روانی بخشے آمین۔ مارچ کے بتول میں پھیلتا ہوا اسلام قاضی حسین احمد کی زندہ تحریر عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے لیے مکمل ڈھارس ہے۔ یقیناً مغرب میں تو اس پودے کی کونپلیں جا بجا نکلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دیکھنے اور پرکھنے والی نظر چاہیے۔موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی اگرچہ حکومت بھی تبدیل ہو چکی ہے امید پہ دنیا قائم ہے اللہ کرے حالات میں بہتری آئے آمین۔ بشرطیکہ ہماری عوام پچھلی پانچ سالہ حکومتی کارکردگی سے نصیحت حاصل کرتے ہوئے ووٹ کا صحیح استعمال کرے۔

ڈاکٹر فلزہ آفاق۔لاہور

اپریل کا بتول موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح دل چاہتا رہا کہ ایک ہی نشست میں ختم کرلیا جائے۔

بہن فریدہ خالد نے ''صحت مند طرزِ زندگی'' میں صحت کی اہمیت اور اس کی حفاظت کے طریقوں کو بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ بلاشبہ صحت ایک امانت ہے اور اس کی حفاظت ہم سب پر فرض ہے۔مضمون پڑھ کر فوراً اس کے مطابق عمل کا ارادہ کیا کسی تحریر یا تقریر کی اصل کامیابی یہی ہے کہ وہ مخاطب کو اپنے رویے یا طرزِ عمل کی اصلاح کے لیے آمادہ کرے۔ پھر آگے بڑھنا اور قائم رہنا فرد کی ذمہ داری ہے۔

آج کے فتنہ پرور دور میں ''چمن بتول'' ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی مانند ہے۔اس باغ نے اپنے دامن میں بہت سے پھول پاکیزہ تحریروں کی صورت میں جمع کر لیے ہیں۔اب یہ سب قارئین کی ذمہ داری ہے کہ اس خوشبو کو اپنے تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے خاندان، پڑوس اور دیگر حلقوں کو بھی اس خوشبو سے آشنا کرائیں۔

عافیہ رحمت۔کراچی

فروری کے سرورق نے آب دیدہ کر دیا۔ وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ ایک دن ہم نے بھی یہاں سے چلے جانا ہے لیکن انسان کی زندگی کا اگر کوئی مشن ہو تو وہ انسان تو چلا جاتا ہے لیکن اس کے مشن کو تھامنے والے ہزاروں آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اس دفعہ کے بتول میں تمام مضامین بہترین تھے۔ قاضی حسین احمد کی زندگی کے تمام گوشوں سے آشنائی ہوئی۔اپنی زندگی کے اندر ان کی دعوت اور ان کا انداز اپنانے کا دل چاہا۔

نصرت یوسف کا طرزِ تحریر مجھے بہت پسند ہے ان

کے ناول کی آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

''محشر میں جنوں میرا'' پسند آیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اسی طرح کی با مقصد زندگی گزارنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔

ڈاکٹر تحریم اعجاز۔ لاہور

امید ہے آپ بخیریت ہوں گی اس ماہ پانچ تاریخ کو بتول ڈاک کے ذریعے پہنچا تو حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ورنہ تو ہر ماہ ۱۵ تاریخ تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہ خوشگوار تبدیلی آئندہ بھی جاری رہے تو بہت خوشی ہو گی۔

رسالہ ملتے ہی جلدی سے قسط وار کہانی نکالی۔ اس کا اختتام، محترمہ نصرت یوسف صاحبہ نے بہت احسن طریقے سے کیا ہے۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ پسند آئی۔ سلسلہ وار کہانی کا، سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

اس کے بعد محترمہ قانتہ رابعہ کا ''سفر سعادت'' نکالا اور پڑھا۔ قانتہ بہت خوبصورت طریقے سے اپنے تجربات اور واقعات بیان کر رہی ہیں۔

باقی سب افسانے بھی اچھے لگے۔ قانتہ رابعہ کی کہانی 'بھنور کی آنکھ' نے زندگی کی بے ثباتی کو اجاگر کیا۔

ربیعہ ندرت کا ''ارمان'' بھی بہت اچھا اور اپنے طرزِ عمل پر غور کرنے والا افسانہ تھا۔

طوبیٰ احسن کے ''دلِ نادان'' اور عالیہ حمید کے افسانے ''چراغ'' نے بھی عمل کے لیے سوچنے پر آمادہ کیا۔ اس دفعہ خاص طور پر افسانوں کا سیکشن اچھا تھا اور مجموعی طور پر پورا رسالہ بھی ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کو اور سب لکھنے والوں کو ہمت، طاقت اور اجر دے۔

صوفیہ خانم۔ لاہور

میں ماہنامہ بتول کی پرانی قاریہ ہوں۔ یہ ماہنامہ اپنے نام کی مناسبت سے مملکت خدادادِ پاکستان کی خواتین میں تقدس اور پاکیزگی کا ماحول پروان چڑھا رہا ہے اور اس مملکت کی بقا کے لیے جانفشانی سے کوششوں میں مصروف ہے۔ ''روشن خیال'' میڈیا کی ساری طاقتیں یہود و نصاریٰ کے ایجنڈے کی تکمیل میں مصروف ہیں اس ماحول میں چمن بتول ہم سب کے لیے مشعل راہ اور منارۂ نور ہے جس کا ہر مضمون قابل تعریف ہوتا ہے۔ تمام لکھنے والی بہنوں کو مبارک۔

رشیدہ کفایت۔ فیصل آباد

بتول ہر ماہ باقاعدگی سے ملتا ہے معیار بلند دیکھ کر

بہت خوشی ہوتی ہے۔ادار یہ تو خاص طور پر بہت اثر انگیز
ہوتا ہے۔صائمہ بیٹی کے لیے بہت دعائیں۔اللہ تعالیٰ
پرچے کو ترقی دے۔(ٹیلی فون پیغام)

☆☆☆

ننگے پاؤں یا سونے کی بیساکھی؟

الیکشن مہم زوروں پر تھی۔ ان دنوں پاکستان کے حالات اتنے دگرگوں نہ تھے اگرچہ ہم ایک بازو سے محروم ہو چکے تھے۔ اور یہ محرومی اور اس کی وجوہات ہر محبّ وطن کا ناسور تھا۔ باقی ماندہ پاکستان میں اچھی قیادت کو سامنے لانے کی تگ ودو عروج پر تھی۔ اسی مہم کے دوران ایک متوسط گھرانے میں ہمارا جانا ہوا جو ایک پروفیسر کا گھرانہ تھا ان کی بیگم سنجیدہ سی خاتون تھیں۔ مہنگائی اس زمانے میں بھی ہر گھر میں براجمان تھی اور اپنے پاؤں پھیلاتی جارہی تھی۔ مہنگائی کا رونا ہر دور کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ اس بھلے زمانے میں (اب بھلا ہی لگتا ہے)

جب عریانی، فحاشی اور میڈیا کی اس طور پر یلغار نہ تھی، کم ازکم بجلی، گیس، پانی اور آٹے کو ترسنے کی نوبت نہ ہوتی تھی۔

بہرحال اس سنجیدہ اور بھلی مانس خاتون سے میں نے ایک سوال کیا کہ

''اگر کوئی ایسی حکومت آجائے جو مہنگائی ختم کردے۔ ہر کسی کو روزگار مہیا ہو جائے۔ کسی کو اپنے حق کے لئے مارا مارا نہ پھرنا پڑے اور ہمارے شہر، امریکہ جیسے ہو جائیں۔ سب خوشحال ہوں۔ دولت کی ریل پیل ہو، تو آپ ایسی حکومت کو لانے کے لئے اپنا ووٹ استعمال کریں گی؟

اس خاتون نے تڑپ کر کہا۔

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں ہم یہی تو چاہتے ہیں۔ کہ مہنگائی ختم ہو.....اور پھر انہوں نے ذرا جوش سے وہ سب باتیں دہرانی شروع کیں جو میں نے ان سے پوچھی تھیں۔

میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے زور دے کر پوچھا۔

''اور اگر اس سب کو حاصل کرنے میں آپ کا ایمان خطرے میں ہو، مسجد، مدرسے بند ہو جائیں۔ آپ اپنی مرضی سے اسلام کے مطابق زندگی گزار نہ سکیں، بچّے نام کے مسلمان رہ جائیں تو بھی؟''

''دیکھو جی، پہلی ضرورت تو انسان کا پیٹ اور تن کا

لباس ہے اگر کوئی روٹی، کپڑا اور مکان دے تو باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

اور ایمان ؟''میں نے روہانسی ہو کر پوچھا تو بولیں۔

''ہر کسی کا ایمان اپنے دل میں ہوتا ہے۔ اس کا حکومتوں سے کیا تعلق؟ وہ گھروں میں آ کر تھوڑا ہی دیکھے گی کہ کون نماز پڑھ رہا ہے کون نہیں؟''

اس گفتگو سے جو کیفیت میرے دل کی ہوئی، اس احساس سے میں پیچھا نہ چھڑا سکی۔ اور پھر جب الیکشن کا دن آیا تو شام کو پولنگ اسٹیشن کے باہر کچھ دیہاتی عورتوں کا گروپ بیٹھا تھا ان کے ووٹ کاسٹ ہو چکے تھے۔ ہم نے ان کو وہاں سے جانے کا کہا تو ان کے جواب سے جو کیفیت ہوئی اس نے اس رنج میں اضافہ کر دیا۔ جو ان سے بہتر خاتون کی باتوں سے ہوا تھا۔

ان دیہاتی خواتین نے کہا۔

''پک اپ بھر کے ہمیں لائے ہیں کہ ہمیں ووٹ دو گے تو قیمے والے نان کھلائیں گے۔ اب وہ لا کر نان کھلائیں گے تو جائیں گے۔''

اب پھر الیکشن قریب ہیں۔ میں دور بیٹھی ہول کھا رہی ہوں کہ اب کیا عوام کی سوچ بدل گئی ہو گی؟ اب تو شاید سوکھی روٹی کھانے کے لالچ میں یا چند کلو آٹے کے لالچ میں ووٹ کی پرچی استعمال ہو گی۔ کاغذ کا ایک پرزہ ہی تو ہے لوگوں کی نظر میں!

اور میڈیا کی یلغار نے ہمارے معاشرے کو جس طرح نفسیاتی الجھنوں کا شکار کر دیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے سوچتی ہوں، متوسط گھرانوں کے لوگ خوشحالی کے معنی جان چکے ہوں گے؟ اور کیا ایک حکومت کا ہمارے ایمان واخلاق اور تہذیب سے کتنا واسطہ ہوتا ہے، لوگ سمجھ گئے ہوں گے؟ یا میڈیا نے اپنے اثرات چھوڑے ہوں گے؟ ساری سیاسی جماعتوں کے دستور میں اسلام اور نظام زندگی کو الگ کیا گیا ہے۔ سیکولر کے معنی لادینیت سے ہٹا کر اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی بنا دیا گیا ہے۔ اور عوام کو خوشحال کر دینے کے جھوٹے خواب..... ہر بات، وعدہ، خواب جھوٹا ہے۔ جو حق سے ہٹ کر ہو اور حق صرف، اسلام ہے۔

کیا امن وسکون غیر اسلام سے مل سکتا ہے؟ اسلام جو سلامتی کا مظہر ہے۔ اور مومن اسی وقت امن میں ہے جب تک ایمان سلامت ہے۔ ووٹ ایک کاغذ کا پرزہ ہی نہیں ایک بہت بڑی گواہی ہے۔ امانت ہے۔ بے لاگ رائے کا اظہار ہے۔ اپنے رب سے اور رسولؐ

سے وفاداری کا اعلان ہے۔

ایک اور رویہ دیکھنے میں آیا، ہر الیکشن کے دوران کہ ''ہم تو غیر جانبدار ہیں۔''

کیا اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری کا امتحان ہو اور اپنا ایمان داؤ پر لگا ہو تو مومن غیر جانب دار ہوسکتا ہے؟ جانب داری ہی تو پرکھی جائیگی؟ آپ کس کی جانب ہیں؟ کس کے نمائندے ہیں؟ کس کے ساتھ کھڑے ہیں؟

یہاں تو پھر ترجیحات کے یقین کی بات آجاتی ہے۔ دنیاوی خوشحالی بغیر دین کے؟ یا دین ترجیح رکھتا ہے؟ دنیاوی عیش وعشرت پسِ پشت ڈال کر زندگی گزارنی ہے ۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر.....یا غیروں کی بیساکھیوں کے سہارے؟ کیا بہتر ہے؟ اپنے پاؤں ننگے ہوں گے اور بیساکھی سونے کی ملے گی!

ہر شخص کو اپنی رائے کی آزادی ہے؟ یا پھر خاندان، برادری، دوستی، جاگیرداری، قوم پرستی، عصبیت پرستی؟ اور یہ سب جاہلیت کی پکار ہے۔

ایسے لوگ نہیں جانتے وہ ظالم کا ساتھ دے رہے ہیں اور اپنے اوپر ظلم کررہے ہیں۔ اور معاشرے پہ ظلم کررہے ہیں۔ ہر ظلم میں حصہ دار بن رہے ہیں۔

عوام کو خودداری، حق رائے دہی اور عزت نفس کا احساس دلانے کی اشد ضرورت ہے۔ اپنی رائے اپنے ضمیر کے مطابق دینا ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور عوام کو اس کی تربیت دینے کی ضرورت ہے۔

غیر تربیت یافتہ عوام ظالم حکمران کو مسلط کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور عوام کو تربیت نہ دینے والے بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ اور عوام کی غلط رہنمائی کرنے والے اس بھی زیادہ مجرم ہیں۔

بخت نصر نے ایک مرتبہ دانیال بنی سے پوچھا۔

''وہ کون سی چیز ہے جس نے مجھے تمہاری قوم پر مسلط کردیا؟

انہوں نے جواب دیا

''اے بخت نصر! تیرے بڑے بڑے گناہوں نے اور میری قوم کے ظلم نے جو خود انہوں نے اپنی جانو ں پر کیا۔''

(امام ابن جوزی از دوائے شافی)

حضرت امام احمدؒ حضرت قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت یونسؑ نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔

''اے پروردگار! تو آسمان پر ہے اور ہم زمین پر۔ تیرے غضب اور تیری رضامندی کی نشانی کیا

ہے؟''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''جب میں تم پر اچھے لوگوں کو حاکم اور سردار بناؤں تو یہ میری رضامندی کی علامت ہے اور شریر بدمعاشوں کو تم پر حاکم بناؤں تو یہ میری خفگی اور ناراضگی کی نشانی ہے۔''

(امام ابن جوزی از دوائے شافی)

جو اپنی رائے نیک آدمی کے لئے دے، اس نے اپنا فرض ادا کیا اور اللہ کی خفگی اور ناراضگی سے بچا۔ جو دوسروں کو بھی اللہ کی خوشنودی کی خوشخبری دے کر دوست اور صحیح رائے دینے کی تلقین کرے اس کو اللہ اپنی رضامندی سے زیادہ نوازے گا۔

ہر پارٹی اپنے منشور کو پیش کرتی ہے اور دعوے کرتی ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے سب سے بہتر پروگرام رکھتی ہے۔ عوام الناس کو فوری اور بنیادی چیزیں جلدی سمجھ آتی ہیں۔ دنیا میں روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بہت مقبول ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ طٰہٰ میں جنت کی جو بنیادی خوبی بتائی ہے اور حضرت آدمؑ و حوّاؑ کو جنت میں داخل کرتے وقت اطلاع دی، احساس اور یقین دلایا۔ یہاں تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بے لباس رہو گے اور نہ بھوک اور پیاس ستائے گی۔ یعنی سرکاری طور پر روٹی، کپڑا اور موسم کے مطابق رہائش عطا کی۔ رب العالمین نے ہر نئے جوڑے کو نئے بندھن میں باندھنے سے پہلے مرد پر جو کہ قوام ہے پابندی لگائی کہ تم اس کے روٹی، کپڑا اور مکان کے ذمہ دار ہو اور جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے غذا، لباس او رمکان کا بندوبست موجود ہوتا ہے۔

گویا یہ ایک فطری قانون ہے کہ سرکار یا سرپرست روٹی، کپڑا اور مکان کا ذمہ دار ہے۔ اور وہ ان بنیادی ضرورتوں کا یقین دلا کر اپنا حقِ ولایت حاصل کرتا ہے۔ ہر فلاحی مملکت کا یہی دستور ہوتا ہے اور اسلام سے بڑھ کر اور کون ہے جو اللہ کے بندوں کی فلاح کا دعوے دار ہو۔ مدینہ کی اسلامی ریاست اس کی گواہ ہے۔

گویا عوام الناس کی فہم و فراست کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی ذہنی استعداد، حالات کی تلخی کے مطابق تربیت شروع کی جائے۔ بنیادی ضرورتیں، جو زندگی کی بنیاد ہیں، ان کے بارے میں یقین دلایا جائے، ان کے اعتماد کو بحال کیا جائے۔ ان کی عزت نفس خودداری اور حق رائے دہی کا احساس زندہ کیا جائے۔ قوم کو باور

کرایا جائے کہ ان کے حقوق ان کو اسی صورت ملیں گے جب وہ خود سر اٹھا کر ان کو حاصل کرنے کی ہمت وجرأت کریں گے۔ اور خود داری، جرأت، ہمت، حوصلہ تو یقیناً صرف ایمان واستقامت کا پھل ہوتا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت
نہیں بدلی
یہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت
کے بدلنے کا

☆☆☆